PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

جنوری ۲۰۱۶ء

نیا سال مبارک

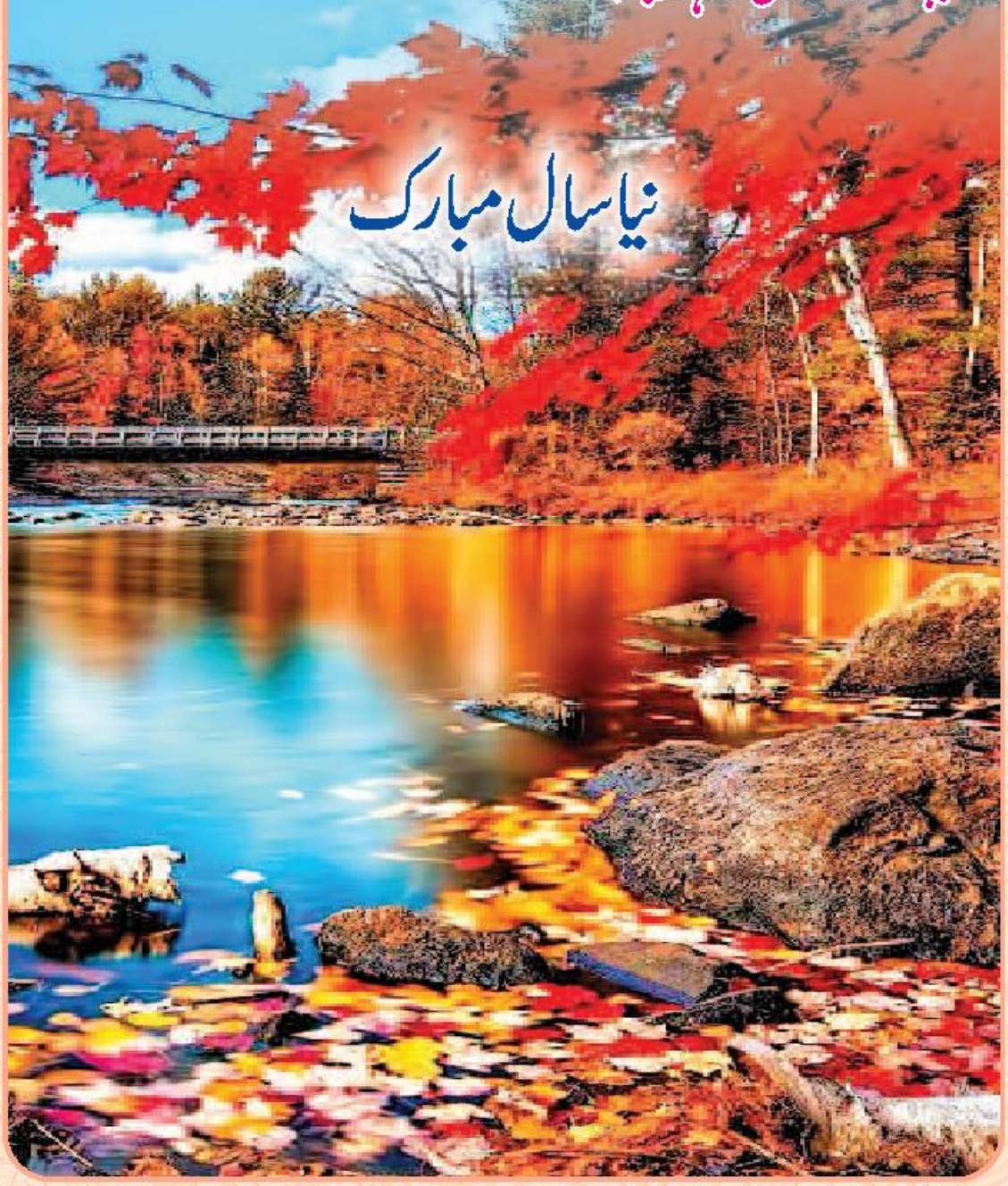

PDF Compressor Free Version

گیا میں ''اکادمی آپ تک'' کا پہلا پروگرام

سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری پروگرام کی غرض و غایت بتاتے ہوئے

اسٹیج کا ایک حسین منظر

پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی
شاہد احمد شعیب کو سند پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی
ناوک حمزہ پوری کو سند پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی
فرحت قادری کو سند پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق اور سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری
شاہد احمد شعیب کو شال اور اعزاز پیش کرتے ہوئے

سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری
جناب فرحت قادری کو اعزاز پیش کرتے ہوئے

سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری
جناب ناوک حمزہ پوری کو اعزاز پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق فرحت قادری کو منظوم پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق اور سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری
شاہد احمد شعیب کو منظوم پیش کرتے ہوئے

پروفیسر محمد اشتیاق احمد ناوک حمزہ پوری کو منظوم پیش کرتے ہوئے

PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۱

جنوری ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	مشتاق احمد نوری	۳
مقالات	شمالی امریکہ کے حقیقی باشندوں کی شاعری	نسیم سید	۵
	دنیا کے نقشے، نقشوں کی دنیا	ڈاکٹر بانو سرتاج	۱۱
	ظفر حسین ظفر کی شخصیت	پروفیسر رضیہ تبسم	۱۴
	آپ ہرن: عصر حاضر کا ایک المیہ	جمیلہ بی بی	۱۷
	شاعر بے نظیر: نظیر اکبر آبادی	اصغری بیگم	۲۱
ناولٹ	پارسا بی بی کا بگھار	ذکیہ مشہدی	۲۳
سفر نامہ	موریشس میں سات دن	پروفیسر اعجاز علی ارشد	۸۱
منظومات	محبت / ایک تصویر.....	رضیہ سبحان	۸۹
	تین نظمیں (''ہندستانی عورتوں کے نام''، ''بنگلہ دیش کی عورتوں کے نام''، ''میرا کیا ہے، تم سوچنا.....'')	تبسم فاطمہ	۹۰
	تیئے برس کا سویرا / ظلمتوں کے سائے	شہلا تزئین / شبانہ عشرت	۹۳
	آرزو / عورت	عاصمہ صدیقی / سیدہ ماہ نور سیدہ	۹۴
	غزلیں	الماس شمی	۹۵
	غزلیں	بدر جہاں خورشید بدر	۹۶
	غزلیں	صدف جہاں / سلمیٰ حجاب	۹۷
کتابوں کی دنیا	میر کلو کی گواہی	ڈاکٹر نعیم شاہد — مبصر: ڈاکٹر شائستہ انجم نوری	۹۸
	کلیاں کھلنے دو	سہیل عالم — مبصر: زیبا پروین	۱۰۰
ہماری سرگرمیاں	گیا میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد		۱۰۳
	پٹنہ کتب میلہ میں شاندار مشاعرہ		۱۰۴
	دربھنگہ میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت محفل اعزاز اور مشاعرہ		۱۰۴
سلام و پیام	پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر مشتاق احمد، کرشن بھاوک، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، ڈاکٹر سید اشرف اسمٰعیل، راشد طراز، کرشن پرویز، صادق علی انصاری، ڈاکٹر قیام نیر، مصباح الدین طارق، ارشد قمر، جمیل اختر خاں		۱۰۶

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرف آغاز

''زبان وادب'' کے سال نو کے شمارے کے ساتھ ہمارے سبھی قارئین کو سال نو مبارک ہو۔ ''زبان وادب'' کا یہ شمارہ کئی لحاظ سے اہم ہوگیا ہے، وہ اس طرح کہ جب کناڈا سے نسیم سید کا ایک مقالہ موصول ہوا اور ذکیہ مشہدی نے ''پارسابی بی کا بگھار'' جیسا خوبصورت ناولٹ بھیجا تو میرے جی میں آیا کہ کیوں نہیں اس شمارے کو خواتین قلم کاروں کے لئے مخصوص کردوں۔

بہار ہی وہ صوبہ ہے جہاں کہ ہردل عزیز وزیر اعلیٰ محترم جناب نتیش کمار نے سیاست میں خواتین کو پچاس فیصد کا حصہ دار بنایا اور اسکول میں پڑھ رہی لڑکیوں کے لئے سائیکل کے ساتھ اسکول ڈریس کا بھی انتظام کرایا۔ اس معاملے میں یہ صوبہ ہر لحاظ سے سب سے آگے ہے۔ خواتین کی حصہ داری نہ صرف آبادی میں بلکہ زندگی میں بھی پچاس فیصد ہے، لیکن ہم اسے نظر انداز کردیتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بالغ نظر ڈاکٹر عبدالغفور وزیر اقلیتی فلاح کی ہمیں شفقت نصیب ہے اور ان کی رہنمائی میں ہمیں بہتر کارکردگی کا موقع مل رہا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخ میں خواتین کی بے پایاں خدمات رہی ہیں اور اس سلسلے سے ہر دور میں گفتگو بھی ہوتی رہی ہے۔ نسیم سید نے اپنے مقالہ میں ''شمالی امریکہ کے حقیقی باشندوں کی شاعری'' پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی وہاں کی نظموں کا خوبصورت ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مضمون سے بھرپور استفادہ کرنے کی گنجائش ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج نہ صرف ایک اچھی کہانی کار اور انشائیہ نگار ہیں بلکہ انہوں نے اچھے مضامین بھی لکھے ہیں۔ ''دنیا کے نقشے، نقشوں کی دنیا'' میں انہوں نے نقشے کے سلسلے میں کافی اہم معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر رضیہ تبسم نے ''ظفر حسین ظفر کی شخصیت'' اور ان کی شاعری پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ ہم ان سے بخوبی واقف ہوجاتے ہیں۔ ظفر حسین جیسے بزرگ کی بھی ہمیں جانکاری ہونی چاہئے۔ جمیلہ بی بی نے عبدالصمد کے افسانہ ''آپ ہرن'' کا بہت خوبصورت تجزیہ کیا ہے جس سے کہانی کی ساری خوبیاں اجاگر ہوگئی ہیں۔ اصغری بیگم نے اپنے مختصر مضمون میں نظیر اکبرآبادی کے فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔

ذکیہ مشہدی کا ناولٹ ''پارسابی بی کا بگھار'' آج کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے اس کہانی میں ایک ساتھ تین نسلوں کو سامنے رکھا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر نسل کا اپنا دور ہوتا ہے، اپنی زندگی ہوتی ہے، اپنے فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں، اسے کسی دوسرے کے تناظر میں نہیں پرکھا جاسکتا ہے۔ میرے خیال سے ذکیہ مشہدی کے قلم میں جو چاشنی ہے اور وہ جس طرح جملے تراشتی ہیں اس سے قارئین یقیناً محظوظ ہوں گے۔

میں نے اس شمارے میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کا ایک خوبصورت سفرنامہ بھی پیش کیا ہے ''موریشس کے سات دنوں کی تفصیل'' آپ کو بھی محظوظ کرے گی اور آپ کو یہ محسوس ہوگا جیسے آپ ماریشس کی خوبصورت وادیوں اور وہاں کی ادبی وثقافتی تہذیب کا خود جائزہ لے رہے ہوں، میں اس سفرنامہ اور تصویر کی فراہمی کے لئے پروفیسر اعجاز علی ارشد کا شکر گزار ہوں۔

منظوم حصے میں بھی صرف خواتین کا بول بالا ہے۔ پروفیسر رضیہ سبحان، کراچی کے عبداللہ گرلس کالج کی پرنسپل رہی ہیں۔ وہ ایک اچھی انتظام کار ہونے کے ساتھ خوبصورت شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کی دو خوبصورت نظمیں آپ کے ذوق کی تسکین کریں گی۔ تبسم فاطمہ کی نظموں میں آپ آج کی مظلوم عورت کو دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں بھی عورتوں پر جبر ہوتا ہے وہاں تبسم فاطمہ اپنے قلم سے اس جبر پر احتجاج کرتی ہیں۔ ان کی تینوں نظمیں ان کے فن پہ دال

PDF Compressor Free Version

ہیں۔شہلا تزئین اور شبانہ عشرت کے ساتھ ساتھ عاصمہ صدیقی اور سیدہ ماہ نور سیدہ کی نظمیں بھی آپ کو متاثر کریں گی، اس کا مجھے یقین ہے۔غزلوں میں الماس شبقی کی خوبصورت غزلیں پیش ہیں وہ امریکہ کے بیچ ریڈیو میں ادبی پروگرام کرتی ہیں۔ان کی بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔بدر جہاں خورشید بدر، سنبھل کی تازہ کار شاعرہ ہیں، ان کی غزلوں کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔یہاں ان کی دو خوبصورت غزلیں پیش ہیں۔صدف جہاں اور سلمیٰ حجاب کی غزلیں بھی آپ کو پسند آئیں گی اور آپ سے داد وصول کریں گی۔

''زبان وادب'' میں تازہ کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں وہ ہر لحاظ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ایک حساب سے ان کی شکل مضمون جیسی ہوتی ہے۔ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ''زبان وادب'' کے تبصرے کا انداز دیگر رسائل سے مختلف ہو''میر کلوگی گواہی'' ڈاکٹر نعیم شاہد کی مرتب کردہ کتاب ہے جس پر ڈاکٹر شائستہ انجم نوری نے بھرپور تبصرہ کیا ہے۔زیبا پروین نے سہیل عالم کے شعری مجموعہ کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔مجھے یہ یقین ہے کہ یہ تبصرے آپ سے پزیرائی حاصل کریں گے۔اس بار بعض وجوہ سے ''بچوں کا زبان وادب'' پیش نہیں کیا جا رہا ہے، انشاء اللہ اس کی تلافی آئندہ کر دی جائے گی۔

''ہماری سرگرمیاں'' کے تحت گیا اور دربھنگہ میں اکادمی کے انوکھے پروگرام ''اکادمی آپ تک'' کی تفصیلات درج ہیں۔ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم اپنے بزرگ ادبا وشعرا کی پزیرائی کریں اور اکادمی ان لوگوں تک پہونچ کر ان کی مجموعی خدمات کا اعتراف کرتی ہے۔اس پروگرام کی کافی پزیرائی ہو رہی ہے۔گزشتہ دنوں اکادمی نے گاندھی میدان کے کتب میلہ میں اپنی مطبوعات کا اسٹال لگایا تھا۔وہاں وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور کی صدارت میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے قارئین ''زبان وادب'' کو کافی سنجیدگی سے لیتے ہیں اور کھل کر اپنی آرا کا بھرپور اظہار کرتے ہیں اور ہماری خامیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ہماری کوشش ہوگی کہ ''زبان وادب'' کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہو۔

بہار اردو اکادمی نے کئی پروگرام کئے ہیں اور بہت سے پروگرام کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ہمارا ایک اہم پروگرام خواتین کا سہ روزہ ادبی کنونشن اور مشاعرہ ہے۔جس کی تیاری تکمیل کے مراحل میں ہے۔یہ پروگرام انشاء اللہ ۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری کو منعقد ہوگا۔خواتین کے ادب کی تفہیم اور ان کے امتیازی پہلوؤں کی طرف غور وفکر کا رجحان زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔عالمی سطح پر خاص طور سے ہندوستان یا اردو معاشرے میں یہ موضوع ابھی حال ہی کی بات لگتی ہے۔ایک زمانہ تھا جب خواتین کے ادب کی اشاعت میں بہت ساری رکاوٹیں تھیں۔بہار کی خاک سے ابھری اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشیدۃ النساء نے ۱۸۸۱ء میں جب اپنا پہلا ناول پیش کیا، اس وقت کتاب میں مصنفہ کے نام کی جگہ ''والدہ بیرسٹر محمد سلیمان'' درج ہوا تھا، لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے اور ادب کے ہر شعبے میں، خواتین کی مستقل حیثیت تسلیم کی جانے لگی ہے۔افسانہ، ناول، نظم، غزل، تنقید، تحقیق، انشائیہ، خودنوشت، سفرنامہ وغیرہ درجنوں صنفوں میں ان کے ادبی کارنامے اردو زبان وادب کی ترقی کے ضامن ہیں۔

خواتین کے اس ادبی کنونشن میں ہم ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی نمائندہ خاتون قلم کاروں کو جمع کرنے کی کوشش کریں گے۔اس کنونشن میں خواتین کے افسانے، ناول کے ابواب، تنقیدی تجزیے اور ادبی مباحث سامنے آئیں گے۔جو کچھ بھی ہوگا وہ خواتین پر ہی ہوگا، نظامت سے لے کر صدارت تک انہیں کے ذمہ ہوگی۔ہماری کوشش ہوگی کہ بزرگ نسل سے لے کر تازہ واردان تک کی بھرپور نمائندگی ہو۔اس سمینار کے مباحث اور پیش کئے تخلیقی وتنقیدی مواد کو کتابی شکل میں شائع کر کے عوام تک پہونچانے کی کوشش کی جائے گی۔تیسرے دن شاعرات پر مشتمل ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ بہار اردو کا ادمی کسی نہ کسی صورت آپ سے جڑی رہے اور ادبی اعتبار سے آپ کے ذوق کی تسکین ہوتی رہے۔آپ کا تعاون اور مشورہ مجھے آگے بڑھنے میں معاون ہوگا۔

PDF Compressor Free Version

نسیم سید

911-225 Webb Drive, Mississauga, Ontario, L5B, 4P2, Canada

شمالی امریکہ کے حقیقی باشندوں کی شاعری

شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کے بارے میں سفید النسل، اکابرین و مقتدرین کا فیصلہ تھا کہ یہ غیر مہذب، غیر ترقی یافتہ نسل دھیرے دھیرے اپنی موت آپ مر جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی صلاحیت جانوروں کی ذہنی صلاحیتوں کی طرح محدود ہے۔ انہیں صرف سدھایا جا سکتا ہے، لیکن ان سے ترقی یافتہ معاشرے کے قدم سے قدم ملا کے چلنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس فیصلہ کی گونج انیسویں صدی کے وسط تک سنی جا سکتی ہے، لہٰذا Diamond Jennessنے (۱۹۳۰ء) میں اپنی کتاب Indians of Canada میں لکھا Doutless all the tribes will disappear, some will endure only a few years longer, others, like eskimo, may lat several centuries ڈائمنڈ جینز کا شمار اس دور کے معروف مفکرین میں ہوتا تھا۔ کچھ اس کی پیشین گوئی اور کچھ سفید النسل مفکرین کا فطری احساس برتری کہ ایک پورا معاشرہ جو اپنی روایات کی گہری جڑوں کے ساتھ موجود تھا، ادبی، سیاسی اور معاشرتی منظر نامہ سے غائب ہو گیا۔ اگر اس دور کے ادیبوں، مورخوں، شاعروں نے ان کا کہیں ذکر کیا بھی ہے تو بیچ یا بیچارے غریب انڈین، جاہل، جنگلی کی اصطلاح کے ساتھ، لہٰذا انڈین نے بھی ان القاب کو اپنا مقدر جان کر کسی حد تک انہیں قبول کر لیا، لیکن یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے سرد ہوا کے تھپیڑے کھا کھا کے درخت بظاہر اپنی تمام ہریالی سے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن زمین کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ان کی جڑیں انہیں مرنے نہیں دیتیں اور اندر سے انہیں سینچتی رہتی ہیں، اگر زمین میں پھیلی ہوئی جڑیں کمزور نہ ہوں تو ذرا سا موافق موسم پاتے ہی یہی درخت ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب نظر آنے لگتے ہیں، لہٰذا انیسویں صدی کے وسط تک سیاست دانوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ مقامی قبائل اپنی موت آپ مرنے کے بجائے اپنی تمام تر روحانی، فکری اور مذہبی روایات کے ساتھ جوں کے توں نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنے زندہ ہونے کا احساس بھی دلا رہے ہیں تو از راہِ ہمدردی انہیں مہذب بنانے کا فیصلہ کیا گیا اس طرح ان کی زمینوں پر ہر طرف اپنے جھنڈے گاڑنے کے بعد فاتحین نے مقامی باشندوں کو بقول ان کے انسان بنانے کی جدو جہد شروع کی اور مذہبی ادارے باقاعدہ طور پر حرکت میں آ گئے۔ Inuits کے اس دور کے تحریر کردہ نظم اور نثر کے نمونے ان کے اس اندرونی کرب کا اظہار کرتے ہیں جس سے وہ خود کو انسان بنائے جانے کے عمل سے گزرتے ہوئے گزرے۔ اس کرب کا اندازہ اس تحریر سے کیجئے:

> ''اس کائنات کے اصل انسان وہ ہیں جنہیں اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ وہ جنہوں نے اس منجمد زمین کو اپنی موجودگی سے پگھلا کے سرسبز فصلیں اگائیں۔ برف کے تودوں کو توڑ کے اپنے لکڑی کے نیزوں سے نیلے پانی کو شکار کیا۔ ہمارے وہ جد عظیم تھے، لیکن ہم اور ہمارے جدان کے لئے حقیر ہیں جو شاید ہماری زمین پر کسی اور سیارے سے آئے ہیں۔ شاید وہ خود کو چاند یا سورج کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ یہ Qallunaat ہمیں ہمارے ہی گھروں میں اجنبی بنا رہے ہیں۔''

وہ انہیں Qallunaat یعنی گھنی بھنوں والا کہتے تھے۔ اسی دور کی تکلیف دہ حیرت کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ اپنی شاعری، خطوط اور مضامین میں کیا ہے۔

Are you on of those white men who forbid the Eskimos to enter thier tent.

PDF Compressor Free Version

سفید آدمی

کیا تم ان ہی میں سے ایک نہیں ہو
جس نے اسکیموز پر پابندی لگادی کہ
وہ اپنے خیموں میں نہ جائیں

ایک اور نظم میں ایسے ہی احساسات کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کرتی ہے۔

"زمین پیروں سے کھینچ کے، کہہ رہے ہیں خوشحال کر رہے ہیں"

جنوب کی سمت سے/ شمالی حدوں سے/ چاروں طرف سے/ اس طرح دندناتے ہوئے/ ہمارے گھروں میں/ کھیتوں میں/ بستیوں میں وہ گھس رہے ہیں/ کہ جیسے سب ان کی ملکیت ہے/ فضاؤں میں وحشی چیخ بوٹوں کی/ ان کے/ ہر سمت بس گئی ہے/ ہواؤں میں ان کی نخوتوں کی/ بساندسی اک رچی ہوئی ہے/ وہ دندناتے ہوئے ہمارے گھروں میں گھس کے/ ہمیں ہمارے گھروں سے بے دخل کر رہے ہیں/ زمیں مقدس ہے/ ماں ہے/ پالا ہے اس نے ہم کو/ ہماری ماں کے بدن کو بوٹوں سے اپنے پامال کر رہے ہیں/ زمیں پیروں سے کھینچ کے کہہ رہے ہیں/ خوشحال کر رہے ہیں۔

احساسات کا ایسا بھرپور اظہار، فطرت سے ایسی ہم آہنگی جس کا اظہار ان کے Oral liturature یعنی songs, chants and speeches میں جگہ جگہ ہوا ہے، حیران کرتا ہے کہ قبل تاریخ کی یہ قوم ذہانت سے کیسی مالا مال تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسکیموز کی زباں میں شاعری کرنے کے معنی میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس کے معنی سانس لینا یا زندگی کی سانسیں ہے۔ ایک اسکیمو شاعر اسی لئے شاید کہتا ہے:

Let me breath of it

اور پھر کہتا ہے:

"میری زبان شاعری کے لعاب سے تر ہے، اگر یہ لعاب
دہن نہ ہو تو میری زباں خشک ہو کے چیخ جائے۔"

Eskimo شاعر Orpingalik اپنی ایک نظم میں شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

میرے گیت میری سانسیں ہیں/ جیسے میرے لئے سانس لینا ضرورت ہے/ ایسے ہی ان گیتوں کی تخلیق/ میری مجبوری ہے۔

جہاں زمیں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہو، ہواؤں کا لہجہ ایسا سرد ہو۔ زندہ رہنے کے لئے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے شدید مشقت کرنی پڑتی ہو، وہاں آباد قوم اظہار کی دولت سے ایسی مالا مال ہوگی۔ Inuits کے گیت پڑھ کے حیرانی ہوتی ہے۔ طرح طرح کے درختوں، پھولوں اور لہلہاتی فصلوں سے سجی سجائی زمیں کے نظاروں سے گزرتے ہوئے اگر ہم قطب شمالی کے بارے میں سوچیں بھی تو دل کی رگیں منجمد ہونے لگتی ہیں اور خیال آتا ہے کہ وہاں رہنے والے کیسی بیزار زندگی گزارتے ہوں گے، لیکن فطرت کے حسن کے متوالے اسکیموز کے احساسات قدرتی نظاروں سے مسحور ہیں۔ انہیں اپنے احساسات کے بیاں پہ نہ صرف یہ کمال حاصل ہے بلکہ اس بیاں میں بڑی گہرائی بھی ہے، ایک نظم دیکھئے:

ستاروں کا گیت

روشنی کے سر میں ہم/ اپنے گیت گاتے ہیں/ آگ کے پرندے ہیں/ آسماں کی وسعت میں/ ہم اڑان بھرتے ہیں/ روشنی کی سر میں ہم/ اپنے گیت گاتے ہیں/ روشنی کے لہجے میں/ ہم صدائیں دیتے ہیں/ روح کے سفر کو ہم/ راستے بناتے ہیں/ اور بھٹکنے والوں کو/ راستہ دکھاتے ہیں/ آگ کے پرندے ہیں/ آسماں کی وسعت میں/ ہم اڑان بھرتے ہیں/ روشنی کے سر میں ہم اپنے گیت گاتے ہیں۔

اسکیموز کے لئے اب Inuits کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور اسکیمو کہنا ایک طرح سے ان کی تذلیل کرنا خیال کیا جاتا ہے، لیکن مورخین نے جب اس دور کے حوالے سے بات کی ہے جس دور کے ان کے گیت ہم تک پہنچے ہیں تو شاید اس دور کے سیاق وسباق کے حوالے سے انہیں اسکیموز ہی لکھا ہے، اس لئے ان کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے میں نے بھی اکثر اسکیمو لکھا ہے۔

اسکیمو کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کا جائزہ ضروری ہے، جس میں انہوں نے زندگی گزاری اور گزار رہے ہیں۔ برف سے ڈھکی ہوئی زمین کو لکڑی کے نیزوں سے توڑ کے مچھلیاں پکڑنا۔ شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔ جانوروں کی کھال سے لباس تیار کرنا۔ Inuits کے بارے میں مطالعہ کرتے ہوئے میں نے جانا کہ ان کی

PDF Compressor Free Version

عورتیں گھنٹوں کھال کے کناروں کو اپنے دانتوں سے چباتی تھیں تا کہ انہیں پتلا کر کے سینے کے قابل بنا سکیں۔ ان کا واسطہ مشینوں سے نہیں بلکہ فطرت سے رہا۔ ان کی تمام تر زندگی فطرت کی ہمراہی میں گزری۔ برف، ہوا، پھول، تتلیاں، بارش، مچھلیاں، بلا وہ سنگھے غرض ان کا چوبیس گھنٹہ کا انہی کا ساتھ رہا۔

وہ جانوروں کی کھال سے بدن ڈھانکتے ہیں۔ اپنی بھوک مٹانے کے لئے ان کا شکار کرتے ہیں، لیکن آج کے ترقی یافتہ انسان سے وہ اس لحاظ سے مختلف دکھائی دیتے ہیں کہ وہ اپنے سے کمزور جانور کو مار کے اس کا سر احساس تفخر کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں لٹکاتے بلکہ وہ اپنے شاعری میں جانوروں کے ممنون نظر آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جانور اپنی زندگی کی قربانی دے کے انسان کو زندگی بخشتے ہیں۔ وہ اپنی مذہبی رسوم میں جانوروں کا روپ دھار کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

Inuits کی تمام تر قدیم شاعری ان گیتوں پر منحصر ہے جو سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل ہوتے رہے، جیسا کہ میں نے اوپر حوالہ دیا تھا کہ ان کے لئے شاعری ایسی ہی ضروری ہے جیسے سانس لینا۔ اسکیموز کی شاعری کو پڑھ کے دو باتوں کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ زندگی کے تمام تر احساسات، غصہ، حیرانی، محبت، ہجر، وصل، عورت مرد کے جسمانی تعلقات، غرض تمام تر جذبات کی ترجمانی پر اپنی تحریروں اور شاعری میں انہیں وہی کمال حاصل ہے جیسی اظہار کی گرفت آج کی ترقی یافتہ زبانوں کے دور میں نظر آتی ہے۔ ادیبوں اور شعرا کے یہاں یورپی اقوام کی آمد پر اپنی ہی زمینوں، اپنے ہی خیموں سے بے دخلی کا تجربہ اور پھر اس تجربہ سے وابستہ احساسات کا اظہار ایسا ہی بھرپور ہے جیسا بوزنیہ، فلسطین، یا عراق کے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں ہمیں آج نظر آتا ہے۔ دوسرا احساس یہ کہ شاعری احساسات کے اظہار کا وہ متاثر کن وسیلہ اور وہ انتہائی powerful tool ہے جس کو ہر دور کے انسان میں مقبولیت اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ قدیم ترین تہذیبوں سومیر، اکادی کی تحریروں کے جو خزانے دریافت ہوئے ہیں ان میں بھی شاعری نثری نظم کی صورت میں موجود ہے۔ شاعری اور موسیقی انسانی فطرت کا ایک اہم جز ہیں، یہ اور بات کہ سومیر کی شاعری پر صرف شاعری کا گمان ہوتا، مگر اسکیموز کی شاعری، شاعری کی تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ میں نے ان کے خیال کو اپنے الفاظ دیئے ہیں تا کہ خیال کی روح نہ مرنے پائے جیسا کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے میں اکثر ہوتا ہے۔ یہ خیال دیکھئے۔

روح

میری ساتھی/ میرے بکھرے دانے چن کے/ کتنے پیار سے/ دانہ دانہ پھر سے/ مجھے پروتی ہے/ میرے بدن کے دکھ سکھ سارے/ اپنے اوپر ڈھوتی ہے/ آنسو میرے ہوتے ہیں/ لیکن میری ساتھی/ میرے سارے آنسو پہ روتی ہے

یہ تمام گیت کسی ایک فرد کے نام سے منظر عام پر نہیں آئے بلکہ مختلف قبائل کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دو گیت Black Foot کے ہیں ایک اور خیال صرف دو لائن میں کس قدر خوبصورتی سے بیاں ہوا ہے۔

اس کائنات میں اب کوئی جگہ محفوظ نہیں
سوائے تیرے آسمان کے

ان نظموں کو پڑھتے ہوئے میں جب ایک نظم "اس لڑکی کا گیت جو پتھر میں تبدیل ہوگئی" تک پہنچی تو اس کی تہہ دار معنویت نے مجھے حیران کر دیا کہ جس نسائی شعور کے ارتقا کو ہم دوسری جنگ عظیم کے بعد پوسٹ ماڈرن تحریک کے تحت جانچتے ہیں وہ تو اس سے کئی سو سال پہلے ان نظموں میں اپنے تمام تر واضع نقوش کے ساتھ موجود ہے۔ میں ان یوانٹس کے ادب اور خاص کر خواتین کی شاعری پر جلد ہی ایک کتاب پیش کروں گی جس میں تفصیل سے مدرسری نظام سے لے کے موجودہ نسائی شعور تک تفصیلی تجزیہ ایب اور بیجنل شاعرات کی تخلیقات کے حوالے سے پیش کروں گی یہ میری ایک چھوٹی سی کاوش ایب اور بیجنل کی فوک شاعری کے حوالے سے ہے۔

مختلف احساسات اور مختلف تجربات کے بھرپور اظہار کی حامل چند نظمیں مطالعہ کے لئے پیش ہیں جن کے خیال کو میں نے اپنے الفاظ میں ڈھالا ہے۔ شاعری کے لفظی تراجم ایسے ایسے نظر سے گزرتے ہیں، میری نظر سے کہ بہت ہی خوبصورت شعر کا ستیاناس ہوتے دیکھا ہے۔ فیض کی غزل "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" کا انگریزی ترجمہ دیکھ کے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا، لیکن جنہیں اردو سے کوئی علاقہ نہ ہو

PDF Compressor Free Version

اور بصد شوق فیضؔ کو تراجم میں جاننا چاہیں تو شاید سر پیٹ کے فیضؔ کی غزلیں اور نظمیں ایک طرف اچھال دیں، اس لئے میں شاعری کے لفظی ترجمہ کی قائل نہیں ہوں۔

میں شاعری کی روح کو مرنے نہیں دینا چاہتی، سو مجھے محنت تو بہت کرنی پڑی، لیکن لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے اس کی روح کو اپنے الفاظ کا پیرہن دیا ہے۔ چند نظمیں مطالعہ کے لئے پیش ہیں۔

افسوس

برف کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے مچھلیاں پکڑنا! کس قدر لطف اندوز تھا/ بھوک کے لئے/ غذا کی بے فکری/ کس قدر طمانیت بخش احساس ہے/ مگر..... کیا میں خوش تھا؟/ نہیں! مجھے تو اپنے چھوٹے سے ہک کی فکر کھائے جاتی تھی/ جس میں مچھلی پھنستی تھی!/ کیا خبر اس میں مچھلی پھنسے نہ پھنسے/ میں کبھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا/ میں خوشیوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتا رہا/ اب برف کی ایک سرد قبر میں پڑے پڑے/ میں دھوپ کا انتظار کرتا ہوں/ سورج کی ایک کرن میری قبر کو نور سے بھر دیتی ہے/ علی الصباح روشنی کی ایک لہر/ مجھے خوشیوں سے گرما دیتی ہے/ افسوس!/ کہ جب سارے موسم میرے تھے/ میں نے ان کی کوئی وقعت نہیں جانی/ میں نے ان کا جشن نہیں منایا/ میں ہمیشہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے فکر مند رہا/ اور قدرت کی تمام نعمتیں/ زندگی کی ساری بخششیں/ نظر انداز کر دیں

Copper Eskimos

Black Foot

(۱)

یہ کیسی آہٹ ہے/ کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے/ کہ جیسے گہری خموشیوں سے نکل کے کوئی/ دبے دبے پاؤں/ میری خلوت میں چل رہا ہے/ میرا صنم ہے کہ/ یہ خدا ہے؟

(۲)

ایک سوال/ مالک کیا تجھے اس بات سے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوتی/ کہ تیرے اور ہمارے درمیاں/ ہمیشہ بادلوں کی دھند چھائی رہتی ہے؟

(۳)

ہر دن کی تقدیر تمہاری مٹھی میں ہے/ سارے اجلے رنگ تمہارے ہاتھوں میں ہیں/ اپنی لکیروں سے ہاتھوں کی/ جیسی چاہو فال نکالو/ جیسے چاہو بات بنالو/ جیسی چاہو فصل اٹھالو/ سارے اجلے رنگ تمہارے ہاتھوں میں ہیں Clayquot

(۴)

مگر نہیں ہے/ سفید و نازک پروں کے جیسی/ یہ برف والی زمیں پیروں تلے ہے میرے/ اک عمر سے اس پہ چل رہا ہوں/ مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے/ زمیں پیروں تلے نہیں ہے/ یہ گنگنا تا حسین دریا/ یہ میرے مشکیزے اک زمانے سے بھر رہا ہے/ مگر میں پیاسا ہوں/ پیاس سے جسم جل رہا ہے/ حسین و نازک میری مگسیتر/ میں اس سے ملتا ہوں روز..... لیکن/ نہ جانے کیوں مجھ کو لگ رہا ہے/ کہ جیسے وہ ہے..... مگر نہیں!/ کیا کریں؟ Ojibwa

ان نظموں کے مطالعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اس دور کی نظمیں ہیں جب مدرسری نظام رائج تھا۔ اس نظم میں شاعر کا مخاطب قبیلے کا کوئی سردار مرد نہیں قبیلے کا بلکہ ایک عورت ہے۔ اس کے علاوہ یہ پوسٹ کالونیل دور کی ایک نمائندہ نظم ہے میرے خیال میں۔

''خواہر عظیم اب تو ہی بتا کہ کیا کریں؟''

خواہر عظیم!/ اب تو ہی بتا/ تو ہی بتا کہ کیا کریں/ ہم اپنی اپنی فطرتوں کو بھیڑیوں کی فطرتوں میں ڈھال دیں؟/ اور اپنے حملہ آوروں کے جسم میں/ اپنے دانت گاڑ دیں/ تو ہی بتا/ کہ زندگی گزارنے کی اور کوئی راہ ہے؟/ ہماری بھوک کے لئے/ کھرچ، کھرچ کے کھائی جھوٹی ہڈیاں/ ہمارا یہ نصیب ہے/ اسی میں اب پناہ ہے؟/ ہمیں یہ فیصلہ سنا/ کہ اپنی اپنی فطرتوں کو بھیڑیوں کی فطرتوں میں ڈھال دیں/ اور اپنے حملہ آوروں کے، سرخ، سبز، لہلہاتے جسم میں/ اپنے دانت گاڑ دیں/ نہیں، نہیں، خدا کے واسطے تم ایسا مت کرو/ تو..... پھر!/ خدا کے واسطے تو ہی بتا کہ کیا کریں؟/ ہم اپنے قالبوں کو بارہ سنگھوں جیسے قالبوں میں ڈھال لیں؟/ ہمارے حملہ آوروں کے ہاتھ میں/ طرح طرح کے تیر ہیں/ ہمیں بچاؤ کے لئے/ کوئی تو ڈھال چاہئے/ ہم اپنے اپنے سینگ ان کے جسم میں اتار دیں؟/

PDF Compressor Free Version

نہیں، نہیں، خدا کے واسطے تم ایسا مت کرو/ اگر..... تو..... پھر/ تو ہی بتا کہ کیا کریں؟/ خواہر عظیم پھر تو ہی بتا کہ کیا کریں؟/ کڑکتے اور گرجتے بادلوں میں خود کو ڈھال لیں؟/ اور اپنے آپ میں تڑپتی بجلیوں سے/ ان کے جسم کو جلا کے/ راکھ سب/ فضاؤں میں اچھال دیں؟/ نہیں..... خدا کے واسطے/ میری سنو/ تم اپنے دشمنوں کی سب کثافتوں کو/ اس زمیں پہ چھوڑ کے/ اونچے، اونچے آسمان میں اڑو/ بدن میں اپنے..... ان تڑپتی بجلیوں کو/ روشنی میں ڈھال لو/ یہ بجلیاں، یہ روشنی/ یہی تمہارے تیر ہیں/ یہی تمہاری ڈھال ہے/ اڑان لو!/ تمہارے سارے دشمنوں کے واسطے/ یہی بس ایک جال ہے/ تمہارے بس میں اور کچھ نہیں، مگر/ یہی بس اک کمال ہے/..... / میں ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے کا گیت گاؤں گا

Opringalik

میں اک گیت گاؤں گا/ میں ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے کا گیت گاؤں گا/ خزاں کے موسموں سے میں علیل ہوں/ میں مثل طفل/ خود سے کیسا بے بس و خجیل ہوں/ جو میری ہم نفس تھیں/ مجھ کو چھوڑ کر چلی گئیں/ رقیب کی چھتوں تلے/ طمانتوں میں بس گئیں/ دکھوں سے، رنج و درد سے وہ بچ گئیں/ مگر میں اپنے دل کی ان اداسیوں کا کیا کروں/ کہ ان کی اس جفا پہ دل/ حزیں و بے قرار ہے/ میں سوچتا ہوں..... کیسا ان کا پیار تھا؟/ کیسا قول ان کا کیا قرار تھا؟/ بدن نحیف و زار ہے/ مگر کسی خیال سے/ خیال لالہ زار ہے/ وہ برف کی طرح سفید بھیڑیے/ میرے شکار کی وہ کس قیامتوں کی چستیاں/ کیسے زیر کر لیا تھا/ ایک ہی جست میں/ اک عظیم سیل کو/ وہ میرے ایک وار کا شکار تھی/ میں اپنے دوستوں میں کیسا شاد و کامران تھا/ کس قدر قوی تھا/ کیسا چست و با گمان تھا/ مگر وہ تب کی بات ہے/ اب تو میں نحیف ہوں/ علیل ہوں/ سویرا جب تلک نئے سویرے کو جنم نہ دے/ اسی طرح اسیر ہوں/ یونہی..... یہاں پڑے پڑے/ میں ایک گیت گاؤں گا/ میں ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے کا گیت گاؤں گا

Ojibwa

میں ابن آفتاب ہوں

میں ابن آفتاب ہوں/ میں اس کے ساتھ ہر صبح طلوع ہو کے/ وادیوں میں/ گھاٹیوں میں/ کھیتوں میں/ مست مست ناچتا ہوں/ ناچتا ہوں شام تک/ اپنے بازوؤں میں اس حسین کائنات کو سمیٹ کے/ مست مست ناچتا ہوں شام تک

Bala Coola

سورج داتا!/ اپنے چہرے سے اس دھند کو پوچھو نا!/ دھوپ اپنے چہرے کی/ ہم کو تا پنے دو نا!.....

Ojibwa

یتیم بچے سے/ کھلے سمندر میں ننھے منے یتیم بچے/ بڑی بڑی مچھلیوں کو مت آسرے سے دیکھو/ تم ان سے ہٹ کے/ ادھر کھسک آؤ/ چھوٹی چھوٹی سی مچھلیاں ہم/ تمہارے بے حال جسم کو ہم سنبھال لیں گے/ تمہیں بھی مل جل کے پال لیں گے

میرے گیت

Orpingalik

میرے گیت میری سانسیں ہیں/ جیسے مجھے زندہ رہنے کے لئے ہر وقت سانس لینے کی ضرورت ہے/ ایسے ہی زندہ رہنے کے لئے ہر وقت گیت لکھنا پڑتا ہے/ یہ مجھے اندر سے طاقت ور بناتے ہیں/ گیت وہ خیالات ہیں جو سانسوں کو ترتیب بخشتے ہیں/ انسان عظیم طاقتوں سے متاثر ہوتا ہے/ اور آج کے دور میں/ صرف جذبات کو بھڑکانے والی/ بازاری اور سستی تقریریں اس کے لئے کافی نہیں/ موسموں کی ذرا سی بے توجہی اسے رنجیدہ کر دیتی ہے/ وہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ برف کی مانند پگھل رہا ہے/ اور چھوٹا ہوتا جا رہا ہے/ اور اسے لگتا ہے اس کے الفاظ اس کے ہاتھوں میں/ برف کی طرح پگھلے جا رہے ہیں/ لیکن یہ تو صرف موسم کے اثرات ہوتے ہیں/ الفاظ کبھی نہیں پگھلتے/ وہ ہمارے اندر محفوظ رہتے ہیں/ اور جب چاہتے ہیں کہ اپنے حسن سے/ دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کریں/ تب ماہتاب کی طرح/ ہماری سوچوں میں/ آپ ہی آپ جگمگانے لگتے ہیں/ اور تب ہم ایک گیت لکھتے ہیں/ ایک نظم تخلیق کرتے ہیں/ اس لڑکی کا گیت جو پتھر میں تبدیل ہو گئی/ کیا کس کے مردو/ ادھر آؤ دیکھو/ تمہاری سزا سے/ میں پتھر ہوئی ہوں/ ادھر آؤ دیکھو/ میں پتھر ہوں، لیکن/ زمیں میں قدم گاڑے/ کیسی کھڑی ہوں/ کیا کس کے مردو/ ادھر آؤ دیکھو/ تمہارے یہ نیزے/ میرے جسم کو چھید کے/ مجھ پہ ہنستے رہے ہیں/

PDF Compressor Free Version

تمہارے یہ ہنٹر/ میرے جسم پر جو/ برستے رہے ہیں/ میرے تن کے پتھر سے/ اب ڈر رہے ہیں/ یہ میں ہوں/ قدم گاڑ کے برف میں جو کھڑی ہوں/ کیا کس کے مردو!/ میں اب تا ابد ہوں!/ میں اب تا ابد ہوں!

مردہ آدمی کا گیت جو ایک زندہ انسان نے خواب میں دیکھا

سورج کی کرنیں جب قبر میں نور بکھیریں/ میں خوشیوں سے بھر جاتا ہوں/ ورنہ خوف سے میرا دم گھٹتا رہتا ہے/ لالچی کیڑے میری آنکھوں/ اور ہنسلی کے حلقوں میں/ آتے جاتے/ رہتے بستے ہیں/ اور میں پڑا سوچا کرتا ہوں/ برف کی اک چھوٹی سی قبر میں ڈال کے مجھ کو/ برف کی سل سے ڈھانک کے مجھ کو/ کیسا وہ سب چلے گئے تھے/ میری سمجھ سے سب باہر تھا/ میری روح کہاں سے اب رستہ پائے گی/ کیسے اب پرواز کرے گی/ کھیل کے اس میدان کی جانب/ جس کے چپہ چپہ میں/ اک عمر کا میری/ ایک اک لمحہ بکھرا پڑا ہے/ اب سارا دن پچھتاتا ہوں/ جاڑے کا موسم کتنا اچھا ہوتا تھا/ مگر کبھی کیا میں نے اس کا جشن منایا؟/ نہیں!/ مجھے تو کھال اکٹھا کرنے کا غم کھاتا تھا بس/ بدن گرم رکھنے کو کافی کھال نہیں ہے/ کتنے حسیں ہوتے تھے موسم گرم دنوں کے/ مگر کبھی کیا میں نے اس کا جشن منایا؟/ نہیں!/ مجھے تو غم رہتا تھا/ اپنے گھر کی دیواروں کو اور ذرا سا اونچا کر لوں/ اور ذرا مضبوط بنا لوں/ اور اناج اکٹھا کر لوں/ یخ بستہ اس گہرے غار میں/ جس کا دہانہ بیچ گیا ہے/ جس سے ٹھنڈا پانی مجھ پر/ بوند بوند گرتا رہتا ہے/ سب کہتے ہیں/ ہائے بیچارہ!/ کتنی جلدی بند ہو گئیں آنکھیں اس کی/ میں ہنستا ہوں/ اب میں پڑا سوچا کرتا ہوں/ آنکھیں تو تب بند تھیں میری۔

شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کی شاعری پر یہ مضمون صرف ان کا مختصر سا تعارف ہے ان کے لٹریچر اور خواتین کی نظمیں کیا ہیں ''گنجینۂ معنی کی طلسم ہیں'' ایک پورے دور اور اس دور کے انسان کے جذبات وفکری دنیا کی تاریخ ہیں۔ یہ زندگی وفن کی رمز آشنا وہ نظمیں ہیں جو جذبوں کے ارتعاش کے ساتھ تامل وفکر کی دھوپ چھاؤں رکھتی ہیں، مسائل حیات ومعاملات ذات سے حریفانہ آنکھ ملانے کے سلیقے اور اس توانائی فکر نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ ان کے تراجم کرنے پر مجبور ہو گئی، لیکن یہ کام میرا ابھی ادھورا سمجھئے۔ ایب اور یجنل کے ادب اور ایب اور یجنل شاعرات کے کلام کا تفصیلی جائزہ جلد پیش کروں گی۔ ❁❁

غزل: ہمارے دل کا استعارہ

''شعر بمعنی شاعری بھی استعمال ہوتا ہے۔ غزل میں دو مصرعوں سے متشکل وحدت کو شعر کہتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر موضوع کے اعتبار سے علیحدہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے، مگر صوتی پیمانے سے سب برابر ہوتے ہیں۔ موضوع کے تنوع نے یہ احتمال پیدا کر دیا ہے کہ غزل میں ریزہ خیالی ہوتی ہے۔ جائے استعجاب! اس پہلو پر ہنوز نفسیات کی روشنی میں غور نہیں کیا گیا ہے۔ اگر دل ودماغ میں لمحہ بہ لمحہ بدلتے تموجات وتخیلات پر غور کیا جائے تو کیا ہم اپنے دل ودماغ کو ریزہ ریزہ قرار دے سکتے ہیں؟ عرش وفرش سے متعلق نہ جانے کیسے کیسے خیالات برابر اٹھتے رہتے ہیں، کیا کیا امیدوں کے تاج محل بنتے رہتے ہیں اور مسمار ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی آرزومندی سنہرے آفاق وثغور دکھاتی ہے اور اس کے فوراً بعد ہی نامرادیوں کے غول بیابانی ہمیں نرغے میں لیتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وصال وہجر بیک لمحہ ہمارے خیالات کو ہم آغوش کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ان تضاداتِ تصورات کی بنیاد پر دل ودماغ کی وحدت ختم ہو جاتی ہے؟ اس نفسیاتی نکتے کی روشنی میں کیا ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ غزل ہمارے دل کا استعارہ ہے اور ہمارا دل غزل کا استعارہ۔ نفسیات میں لمحہ بہ لمحہ، تو بہ تو خیالات کی تعمیر وتخریب کو 'سیل شعور' کی اصطلاح دی گئی ہے...... ہر غزل ایک مخصوص صوتی آہنگ (بحر) میں کہی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ صوتی آہنگ شعروں کو ہم آہنگ رکھتا ہے۔ ہر اچھے شاعر کا ایک مخصوص انداز نظر ہوتا ہے لہٰذا اس کی کہی ہوئی غزل کے اشعار ایک طرح کے وحدت تاثر سے ضرورت متصف رہتے ہیں۔''

(ماخوذ از مقالہ ''غزل ولتزمات غزل'' تاراچند رستوگی، مشمولہ مجلّہ ''جدید فکر وفن'' شملہ، غزل نمبر ج ۴ ش ۱۳ ص ۱۰)

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر بانو سرتاج

Opp. Akashwani, Civil Lines, Sartaj House, Chandrapur 442401 (M.S.)

دنیا کے نقشے، نقشوں کی دنیا

نقشہ پڑھنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ آپ اسے صرف نصاب کی ضرورت سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ شوق کے تحت پڑھ کر دیکھیں۔ پھر دیکھیں کتنا مزا آتا ہے۔ دنیا بھر کے ملکوں، ان کی تہذیب کو جاننے، ندی پہاڑ کے ساتھ چلنے، باتیں کرنے، ریل سڑک، ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں کتنا لطف آتا ہے اور جانئے کہ آپ کی جنرل نالج میں کتنا اضافہ ہوا؟ چلئے ہم آپ کی تھوڑی سی مدد کرتے ہیں۔ دنیا کے نقشوں اور نقشوں کی تاریخ سے آپ کو واقف کراتے ہیں کہ نقشہ بنانے کا آغاز کب ہوا؟ کہاں سے ہوا؟ کس ملک نے کیا؟ کب کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

نقشے بنانے کا فن کارٹوگرافی (Cartography) کہلاتا ہے۔ نقشوں کی کتاب کو اٹلس (Atlas) کہتے ہیں۔

نقشہ (Map)

سمت (Direction)	فاصلہ (Distance)	علامت (Symbol)

سمت: نقشہ کی چار بنیادی سمتیں ہوتی ہیں، شمال، جنوب، مشرق اور مغرب۔ جنہیں بنیادی سمتیں (Cardinal Directions) کہتے ہیں۔

فاصلہ: نقشہ میں ایک مقام دوسرے مقام سے کتنے فاصلہ پر ہے یہ بے حد اہم ہے۔

علامت: نقشہ میں شہر، پہاڑ، ندی، پوسٹ آفس، اسٹیشن، ہوائی اڈہ وغیرہ مختلف نشانوں سے واضح کیے جاتے ہیں۔

نقشوں کی تین اہم اقسام ہیں:

(۱) طبیعی نقشہ (Physical Map)

(۲) سیاسی نقشہ (Political Map)

(۳) موضوعاتی نقشہ (Thematical Map)

☆ طبیعی نقشہ میں ملکوں کی تعداد، ان کی وسعت، ان کے ندی پہاڑوں جنگلات وغیرہ بتائے جاتے ہیں۔

☆ ریاستی انتظامات کی ضروری معلومات سیاسی نقشوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

☆ مختلف موضوعات جیسے موسم، نباتات، جنگلات، صنعت و حرفت، ریل کی سہولیات پر الگ الگ بنائے گئے نقشے موضوعاتی نقشوں کے تحت آتے ہیں۔

سب سے قدیم کارٹوگرافی ملک چین کی دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے بعد یونان کا نمبر آتا ہے۔ ۲۳۰۰ قبل مسیح میں بے بی لون (Babylon) میں نقشے تیار کیے گئے۔ مصر میں دھات کی پلیٹوں پر نقشے بنائے جاتے تھے۔ اسکیمو لوگوں نے جانوروں کی کھالوں پر نقشے تیار کیے اور زمانہ حال میں کمپیوٹر سے نقشے بنتے ہیں۔

☆ عہد وسطیٰ میں مذہب کو مرکز میں رکھ کر مٹی میں نقشے بنائے جاتے تھے۔ وہ T.O. Map کہلاتے تھے، ان نقشوں کے درمیان عیسائیوں کے مذہبی مقام پروشلم کی تصویر بنائی جاتی تھی۔

☆ بارہویں صدی میں سسلی (اٹلی) کے بادشاہ راجر دوم کے دربار سے منسلک مسلم سائنس داں آل ادریسی (Al-Idrisi) نے مکمل دنیا کا نقشہ بنایا۔ یہ نقشہ آج بھی نقشوں کی دنیا میں اہم مقام رکھتا ہے۔

☆ پندرہویں صدری تک پرنٹنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ سولہویں صدی میں تانبے کی تختیوں سے لکڑی پر کندہ (Engraving) کر کے نقشے بنانے کا آغاز ہوا۔ ان نقشوں میں سمندری ساحل، بندرگاہ (Harbour) جزیرہ وغیرہ دکھائے جانے لگے۔ کمپاس لائنیں

PDF Compressor Free Version

(Compass Lines) جوڑ دی گئیں۔

☆ ۱۵۰۷ء میں وَل دسی ملرس (Waldasi Mulers) نے دنیا کا نقشہ تیار کیا۔

☆ ۱۵۰۸ء میں روسیلی (Roselly) نے بھی ورلڈ میپ تیار کیا جس میں پورا گلوب جگہ پا گیا تھا۔

☆ ۱۵۶۹ء میں کافی تحقیق کے بعد کولمبس (Columbus) نے پروجیکشن تکنیک سے نقشہ تیار کیا جس سے نقشہ پڑھنا اور سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا۔ اس نے پروجیکشن سے بنائے نقشوں کو پرنٹ بھی کیا۔

انیسویں صدی میں یورپ میں میٹرک سسٹم (Metric System) کی ایجاد ہوئی، اس میں گرین وچ میری ڈین (Greenwich Meridian) بنایا گیا۔ جس سے اغلاط سے پاک نقشے بننے لگے، Map Remote Sensing Technique کا استعمال کیا جانے لگا۔

۸۰-۱۸۷۰ء کے دوران جی۔آئی۔ایس (Geographical Information System) نے بہتر آسانیاں مہیا کرادی ہیں جس کے تحت سوفٹ ویئر، ڈیجیٹل ڈاٹا، کنکشن اسٹورنگ، کمپیوٹر، ایریل فوٹوگرافس اور دوسری Electric Devices سے کام لیا جانے لگا ہے۔ اس سے نقشے کے فن میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔

ہندوستان کا پہلا نقشہ سترہویں صدی میں پادری مان سے رینٹ (Manse Raint) نے بنایا تھا۔ وہ شہنشاہ اکبر کا مہمان تھا۔ وہ نقشہ آمدورفت کے ذرائع کی پیائش کے لئے علم ہیئت کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ وہ نقشہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

☆ ۱۶۱۹ء میں جہانگیر کے دور میں سرٹامس دو نے ایک نقشہ بنایا۔ پیش لفظ میں اُس نے لکھا "جو ہم نے دیکھا وہ سچ ہے، جو ہم نے نہیں دیکھا وہ زیادہ سچ ہے۔" سرٹامس رو کے اس نقشہ سے لندن اور ہندوستان کے درمیان تجارت میں کافی آسانیاں پیدا ہو گئیں اور یہی انگریزوں کا مقصد بھی تھا۔ تجارت کے ذریعہ ہی انگریز ہندوستان میں قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

☆ ۱۷۵۲ء میں ایک فرانسیسی ڈی۔این۔ولے نے جو نقشہ تیار کیا اس میں سمندری ساحل، کچھ خاص ندیاں اور بمبئی (ممبئی) کلکتہ (کولکاتا) مدراس (چینئی) وغیرہ سمندری کناروں پر بسے ہوئے شہروں کی نشان دہی کی گئی تھی۔

بعد میں انگریزوں نے بنگال ریذیڈنسی پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسیوں سے مدراس ریذیڈنسی بھی چھین لی۔ مقبوضہ علاقوں کی وسعت کے ساتھ ان علاقوں کے سروے کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی۔ سروے کے تین اہم مقاصد طے ہوئے:

(۱) مقبوضہ علاقوں کے لگان کا تخمینہ لگانا۔

(۲) مقبوضہ علاقوں کے ساحلی اور اندرونی علاقوں میں نظامِ مواصلات کا جائزہ لینا اور

(۳) مقبوضہ علاقوں کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے ضروری اقدامات کرنا۔

اس سروے کے لئے بطور خاص "سروے آف انڈیا" محکمہ کا قیام عمل میں آیا۔ ایک پرحوصلہ نوجوان رے نیل (Ray Neel) کو اس محکمہ کا انچارج بنایا گیا۔

☆ ۱۷۶۴ء میں رے نیل بذاتِ خود ایک ڈونگی میں سوار ہو کر گنگا کے راستے کلکتہ (کولکاتا) پہونچا اور کامیاب و کامران واپس لوٹا۔ اس سفر میں اُسے ایک سال کا عرصہ لگا۔ اس نے کلکتہ پہونچنے کا قریب ترین دریائی راستہ دریافت کیا تھا جس کے لئے ابتدا میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ بعدازاں اس نے سمندری راستے کا نقشہ اور گنگا ڈیلٹا کا نقشہ بھی تیار کیا۔ رے نیل نے دلدلوں، جنگلوں، ندیوں، سمندر میں کئی سفر کئے۔ موسمی بخار، بیماریوں اور جنگلی جانوروں کا سامنا کیا، اُس نے قریب پانچ سو سروے کئے اور ماہرین کی ایک بڑی جماعت تیار کی مگر برٹش حکومت نے اس کی وہ قدر نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔ حکومت ہندوستان میں اقتدار قائم کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ رے نیل حکومت کے رویے سے ناخوش رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ انگلینڈ واپس چلا گیا۔

☆ ۱۸۰۲ء میں ولیم لیمبٹن (Willim Lambton) نے

PDF Compressor Free Version

سرویئر جنرل (Surveyer General) کا عہدہ سنبھالا۔ وہ بھی پرحوصلہ، محنتی اور ایماندار شخص تھا۔ اس نے جنوبی کنارے سے ہمالیہ کی ترائی تک پورے ہندوستان کا نقشہ تیار کرنے کی اسکیم بنائی اور سروے کا آغاز کیا، مگر بیس برس میں اس کے پلان کا صرف پچاس فیصدی حصہ ہی مکمل ہوسکا۔ پھر بھی ولیم لیمبٹن کا کام دنیا کے کسی بھی نقشہ کے لئے کیا گیا سب سے اہم سروے مانا جاتا ہے۔

☆ ۱۸۱۷ء میں ولیم لیمبٹن کے بعد جارج ایورسٹ کا اس پوسٹ پر تقرر ہوا۔ کافی جوش کے ساتھ وہ اور اس کے ساتھی ولیم کے کام کو آگے بڑھانے لگے اور کامیاب ہوئے۔ جارج کے بعد اینڈریو۔ وانے اس پروجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانیوں نے اس کام میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ شمالی پہاڑیوں کا سروے کرنے میں بے انتہا مشکلات سامنے آئیں کیونکہ چین کے بادشاہ نے ہندوستان سے تبت جانے والے راستہ پر روک لگادی تھی۔

سروے تو کرنا ہی تھا۔ کافی غور وفکر کے بعد تھامس مونٹ گومری (Thomas Mont Gomri) نے مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ بھکشوؤں کے ذریعہ کام کیا جائے تو خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔ بھکشوؤں کے تبت میں داخلے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ تھامس تربیت یافتہ جوانوں کو بھکشوؤں کے بھیس میں تبت روانہ کرتا جہاں سے وہ ضروری معلومات جمع کرکے لے آتے اور کام جاری رہتا، مگر یہ ترکیب زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکی۔ ایک واقعہ نے نقشہ بنانے کا کام کو درمیان ہی میں روک دیا اور پھر ایک عرصہ تک یہ رکاوٹ دور نہ ہوسکی۔

دراصل ان دنوں اس سوال کا جواب ڈھونڈا جارہا تھا کہ آیا سانگپو اور برہم پترا ایک ہی ندی کے دو نام ہیں یا دونوں ندیاں الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ کن تھپ نامی ایک تربیت یافتہ جوان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ ایک مقررہ دن سانگ پو ندی میں لکڑی کے پانچ سو لٹھے ڈال دے۔ لٹھے پانی کے بہاؤ کے ساتھ جہاں جہاں سے گزریں گے وہاں کا حساب رکھا جائے گا اور اسی بنا پر آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

کن تھپ بھکشو بن کر ایک لاما کے ساتھ تبت پہونچ تو گیا مگر لاما نے دھوکہ دے کر اسے فروخت کردیا۔ گیارہ مہینوں تک کن تھپ نے غلامی کی زندگی گزاری پھر موقع پا کر فرار ہوگیا۔ مقررہ تاریخ گزر چکی تھی، مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ لہاسا سے ایک خط میں ''سروے آف انڈیا'' آفس کو اپنی روداد لکھ بھیجی اور اطلاع دی کہ اب وہ فلاں تاریخ کو لٹھے ندی میں ڈالے گا۔ اس نے درخت کاٹ کاٹ کر لٹھے تیار کئے اور پانی میں بہادئے، مگر برہم پترا ندی میں ان کا حساب کرنے، ریکارڈ رکھنے والا کوئی نہ تھا کیونکہ کن تھپ کا خط آفس میں پہونچا ہی نہیں تھا۔

اس زمانہ میں کارٹوگرافی اس طرح بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچتی تھی۔ آج تو زمانہ بہت ترقی کرگیا ہے۔ سائنس اور جدید ٹکنالوجی نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس فن کو جلا بخشی ہے۔ نقشوں کی دنیا بہت وسیع ہوگئی ہے۔ ❁❁

حسن افکار

☆ اگر آپ اُڑنا چاہیں تو اپنے بال و پر کے ساتھ اُڑ سکتے ہیں، کسی اور کے پروں پر بھروسہ کرنے والا کبھی پرواز نہیں کرسکتا

☆ انقلابات معمولی باتوں پر نہیں آتے مگر یہ معمولی باتوں سے جنم لیتے ہیں

☆ برائی کرنے والے سے نہیں بلکہ برائی سے نفرت کرو

☆ ہر چیز کو اس طرح دیکھو جیسے پہلی اور آخری بار دیکھ رہے ہو اس طرح دنیا میں تمہارا وقت بہت شادمانی سے کٹے گا۔

☆ اگر غرور کوئی علم ہوتا تو اس کے سند یافتہ بہت سارے ہوتے

☆ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے اگر یہ سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں

☆ حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنادیتی ہے

☆ سونے کو آگ پرکھتی ہے اور انسان کو مصائب زمانہ

☆ خاموشی علم و حکمت کے دروازوں میں سے ایک ہے

☆ وقت، ہوا اور دولت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں

PDF Compressor Free Version

پروفیسر رضیہ تبسم

Sharif Colony, Patna 800006

ظفر حسین ظفرؔ کی شخصیت

ظفر حسین ظفرؔ کا تعلق بہار کے مشہور و معروف صوفی خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے صوفی بزرگ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں تاتاریوں کے حملے کے بعد ہندوستان آئے اور راجگیر میں سکونت اختیار کی ان کا نام پیر امام الدین شطاری الحسینی تھا۔ انہیں اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے داماد میر سید عبدالسمیع (راجگیری) ان کے سجادہ نشیں ہوئے۔ یہ سید ابولفرح واسطی زہد الحسینی کی اولاد میں تھے۔ اس طرح ظفر حسین ظفرؔ کے جد امجد میر عبدالسمیع ہوئے۔ ظفر حسین ظفرؔ کے والد میر فضل امام کی شادی پاٹی گلی بنواری ٹولہ پٹنہ سیٹی کے رئیس سید واحد حسین کی صاحبزادی سے ہوئی، لیکن ولادت کے فوراً بعد والدہ کا انتقال ہوگیا اور خالہ زاد بہن نے گود لے کر ان کا نام ظفر حسین رکھا اور لاڈ و پیار سے ان کی پرورش کی۔ ان کے والد نے دوسری شادی میر جعفر علی (سرتھوآ) کی صاحبزادی سے کی، ان کے بطن سے سید مظہر امام تھے۔ میر فضل امام کے پردادا میر سید شاہ عبدالواحد نے راجگیر ضلع، نالندہ سے منتقل ہو کر موضع سربہدا ضلع گیا میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے مظہر امام نے موضع سربہدا اپنے دادھیال کو آباد کیا۔ ظفر حسین کو نانیہال کے لوگ ظفر حسین تو دادھیال والے ظفر امام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

پاٹی گلی بنواری ٹولہ کے جس گھر میں ظفر حسین کی پرورش ہوئی وہ گھر نہیں محلہ تھا اس میں گیارہ آنگن تھے اور اندر میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانات تھے۔ سبھوں کے پھاٹک الگ الگ تھے کسی کا پھاٹک پچھم میں تھا تو کسی کا پورب کی طرف، سبھی مکانوں میں ان کے ماموں، خالہ اور خالہ زاد بھائیوں کی رہائش تھی۔ کہتے ہیں کہ شہزادہ عظیم نے جب پٹنہ کا نام عظیم آباد رکھا اور اس کو اپنے طور پر آباد کیا اس وقت اپنے کارندوں کو اس نے جہاں بسایا ان محلوں کا نام ان کے کام و عہدے کے اعتبار سے رکھا جیسے دھول پورہ، بنواری ٹولہ، خواجہ کلاں، لودی کٹرہ بخشی محلہ، دیوان محلہ وغیرہ۔ سیٹی کا پچھم دروازہ اور پورب دروازہ آج بھی اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ شہر کی حفاظت اور کے لئے یہ دروازے بند ہو جاتے ہوں گے۔ پٹنہ سیٹی کے محلے تاریخی اہمیت کے حامل تھے اور اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ یہاں صوفیوں، رئیسوں، زمینداروں اور نوابوں کا ٹھکانہ تھا۔

میتن گھاٹ کی خانقاہ، تکیہ کی خانقاہ اور منگل تالاب کی خانقاہ کے بزرگوں کے سماجی تعلیمی و مذہبی خدمات سے آج بھی پٹنہ سیٹی اور اردگرد کے مسلمان بخوبی متعارف ہیں۔ یہاں کے رئیسوں، نوابوں اور زمینداروں کی آپس میں بیٹھتی تھی، وہ سب تہذیب و تمدن کا اعلیٰ نمونہ تھے، ان کے خیال میں صفائی، بیان میں صداقت اور سادگی تھی، جس گھر میں جائیں بڑے بڑے آنگن اور ڈیوڑھی و خلوت ضرور ہوتی کوئی انجان آدمی ڈیوڑھی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، بہو بیٹیوں کے آرام کے لئے خلوت ہوتی، زنان خانہ اور مردان خانہ الگ الگ ہوتا، نوکروں کی رہائش کا بھی الگ انتظام تھا۔ ٹوپی اور شیروانی کے بغیر رئیس گھر سے باہر نہیں نکلتے، ایک مولوی صاحب مذہبی تعلیم کے لئے ضرور ہوتے، ہندو مسلم، شیعہ سنی، دیوبندی و بریلوی کا کہیں کوئی تذکرہ نہ تھا۔ الفت و محبت کا دور تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان آزاد ہوگیا، ذہنی آزادی ضرور ملی، لیکن پٹنہ سیٹی کے زمینداروں کی زندگی جس

PDF Compressor Free Version

چین وسکون سے زندگی بسر ہورہی تھی اس میں گہن لگ گیا۔ جناب ظفر حسین بھی زمیندار تھے، لیکن کبھی زمینداری کے کاغذات کو خود نہیں دیکھا ان کے گہرے دوست کچی گھاٹ میں بھنی پرشاد، ایشور پرشاد اور جگدیش پرشاد تھے جنہوں نے ان کے کاغذات کی دیکھ بھال کی اور زمینداری کا حساب کتاب رکھا۔

ظفر حسین نے گھر پر مذہبی تعلیم حاصل کی اور پٹنہ سیٹی ہائی اسکول سے امتیازی نمبر کے ساتھ میٹرک پاس کیا، لیکن کبھی سرکاری نوکری کی طرف راغب نہیں ہوئے۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا جو پروان چڑھتا گیا۔ کواوپریٹو بینک میں نوکری ملی، لیکن نظم لکھ کر ریزائین کردیا۔ ان کے بھائی مظہر امام اور تجمل حسین ممبر آف پارلیامنٹ تھے، لیکن کبھی کسی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ڈرامہ لکھنے کا شوق تھا اور ان کے لکھے ہوئے ڈرامے کچی کھاٹ، ایشور پرشاد کے مکان میں اسٹیج ہوتے۔ ابھی بھی ان کے مکان میں اسٹیج قائم ہے۔ پروفیسر پرویز شاہدی اور یہ خود ڈرامہ کے کسی نہ کسی کردار کو ادا کرتے۔ پٹنہ سیٹی میں مشاعرہ کا دور تھا، شہادت نامہ اور مولود شریف کی مجلس بھی خوب سجتی تھی۔ شاید پائی گلی کا وہ آخری مشاعرہ تھا جس میں مبارک عظیم آبادی، سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی (شاہ جھبو) فصیح الدین بلخی، پروفیسر پرویز شاہدی، انوار کریم (ہیڈ ماسٹر محمڈن اسکول) یعقوب عظیم آبادی اور ظفر حسین شریک تھے۔ مشاعرہ ظہور حسن صاحب (حجن صاحب) پائی گلی کے وسیع ہال میں ہوا اور اس مشاعرہ کی ابتدا میں مظفر امام (ظفر امام کے بیٹے، عمر سات سال ہوگی) نے اپنا تعارف شعر میں کرایا تھا۔

ہے فرض آپ سے اپنے کو ملانا میرا
کیا نام ہے اور کہاں ٹھکانا میرا
ناچیز کو کہتے ہیں مظہر امام
ہے پائی گلی غریب خانہ میرا

وقت کے ساتھ پرانی قدریں پامال ہونے لگیں۔ بے چینی، مایوسی، ہراس، بے سروسامانی، مفلسی اور پستی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ خواجہ کلاں ہو یا دھول پورہ، بخشی محلہ ہو یا پائی گلی، شاہ کی املی ہو یا لودی کٹرہ، صدر گلی ہو یا کشمیری کوٹھی، ٹیڑھی گھاٹ ہو یا دیوان محلہ ان تمام جگہوں کے رئیسوں کی نجی زندگی ملک کی تقسیم کے ساتھ قتل وغارت گری سے بیحد متاثر ہوئی اس لئے کچھ تو اپنی جائیداد فروخت کرکے پاکستان چلے گئے اور کچھ لوگوں کی اولاد نے سیٹی سے باقی پور پھر امریکہ، کناڈا اور انگلینڈ جاکر بسنا پسند کیا۔ زمینداری کا کاغذ جمع کرنے کے بعد جناب ظفر حسین کو بھی بیحد صدمہ ہوا ان کے پاس ایک حویلی کے سوا کچھ نہیں بچا۔

پائی گلی سے بھی ان کے سبھی رشتہ دار پاکستان یا مریکہ منتقل ہوگئے اگرچہ چند فیملی کے افراد جن کی روزی روٹی کا بندوبست ہوگیا تھا یا والدین کی محبت تھی وہ ابھی بھی پٹنہ سیٹی میں رہ رہے ہیں اور ان کے پرانے گھر آباد ہیں، لیکن ظفر حسین کے بیٹے مظفر امام نے اپنے مکان سے بہتر باقی پور میں رہنا پسند کیا۔ ۱۹۵۲ء میں جناب ظفر حسین کو فالج کے شکار ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، تب ان کے بیٹے مظفر امام بھی اوروں کی طرح اپنے ملک کو الوداع کہہ کے کراچی جا بسے۔

اردو زبان وادب میں جناب ظفر حسین ظفر کی گراں قدر خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا انہوں نے ڈرامہ لکھا، انگریزی پوئٹری کا اردو میں ترجمہ کیا (موسی گرے کا ترجمہ بہت پسند کیا گیا تھا) اور حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم نوحہ اور سہرا لکھ کر زبان وادب کی خدمت کی۔

ظفر حسین ظفر نے مہاتما گاندھی کی رحلت پر نوحہ لکھا جو اس وقت اخبار میں چھپا تھا اس کی ایک نقل ملی ہے جو پیش ہے۔

نوحہ

از ظفر حسین، پائی گلی، پٹنہ سیٹی مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء

فلک کیسا یہ تو نے ظلم ڈھایا
اندھیرا سارے عالم میں ہے چھایا
چرخ زندگی یوں جھلملایا
کہ ناحق خون گاندھی کا کرایا
بگڑتا کیا جو کچھ دن اور جیتے
یہ بھر بھر جام آزادی کا پیتے
صفت اوتار کی لے کر یہ آیا
صداقت رحم اور انصاف لایا

PDF Compressor Free Version

سچائی سے بہت کچھ کر دکھایا
اہنسا کا سبق سب کو پڑھایا
یہی ہستی تھی جس نے آج ہم کو
دلایا ہند میں سوراج ہم کو
وطن آزاد ہو ، تھی دل میں ٹھانی
اٹھائی زندگی بھر جاں فشانی
مٹائی سب کے دل سے بدگمانی
یکایک آفت آئی آسمانی
قضا آئی یہ دنیا سے سدھارے
جئیں گے ہائے اب کس کے سہارے
زمانے بھر میں تھا ممتاز گاندھی
ملا کتنا بڑا اعجاز گاندھی
اٹھایا تو نے سب کا ناز گاندھی
بجا ہر سر میں تیرا ساز گاندھی
وطن کی آرزو پوری کرایا
نجات آخر غلامی سے دلایا
تجھی نے ساری دنیا کو سکھایا
تجھی نے راہ پر سب کو لگایا
تجھی نے میل آپس میں کرایا
تجھی نے تفرقہ دل سے مٹایا
ترے ہی دم کا یہ سب ہے اُجالا
تجھی نے ڈوبتی کشتی سنبھالا
تری ہستی وہ تھی نایاب ہستی
بلندی پر ہوئی ہر ایک پستی
بلا مٹے کے تھی چھائی سب پہ مستی
کہ ہر اک بھول بیٹھا اپنی ہستی
یہ جادو تھا خدا جانے کہاں کا
کہ پھیکا پڑ گیا رنگ آسماں کا
تیرا ماتم جہاں میں ہو رہا ہے
ہر اک ادنیٰ و اعلیٰ رو رہا ہے
جدائی سے تیری جاں کھو رہا ہے
اور کینہ اپنے دل سے دھو رہا ہے
زمانے میں ترا چرچہ رہے گا
تیرے ہی نام کا ڈنکا بجے گا
خدا سے اتنی میری التجا ہے
ہر اک فرد و بشر کی یہ دعا ہے
بدولت ان کے جو کچھ بھی ہوا ہے
پھلے پھولے جہاں یہ مدعا ہے
نہ ٹوٹے آسرا اہل وطن کا
ظفر بدلے نہ رنگ اس انجمن کا

افسوس کہ ان کی بیاض کچی گھاٹ جاتے ہوئے کہیں گر گئی اور تلاش کے بعد بھی نہیں ملی۔ ان کی ایک تہنیتی نظم ''مبارکباد'' محمد اجمل جامعی کی کتاب ''بہار کی ایک علمی شخصیت: مظہر امام'' میں ص ۳۹ پر درج ہے ۔

(از سید ظفر امام ابن سید فضل امام برادر حقیقی سید مظہر امام بہ موقع خطاب خان صاحب سید مظہر امام خسرو پور ۴، جنوری ۱۹۳۵ء)

خوشا نصیب کہ جس کو وہ امتیاز کرے
خوشا وہ دل کہ جسے آشنائے راز کرے
مبارک ہو تمہیں مظہر خطاب خاں صاحب
بجا ہے تم پہ خوشی میں جو بخت ناز کرے
سبھی کا کام نہیں اتنا پوپلر ہونا
یہ اس کی دین ہے جس کو وہ سرفراز کرے
تمہارے کام سے پبلک بھی خوش، حکومت بھی
مجال کس کی جو کچھ کوئی احتراز کرے
یہ عاجزی ، یہ خوش اخلاقیاں یہ پوزیشن
عطا یہ دین جسے چاہے بے نیاز کرے
بہار بن کے کھلاتے رہے ہو جس گل کو
تمہیں بتاؤ وہ کیونکر نہ تم پہ ناز کرے
دعا ظفر کی ہے مظہر سدا پھلے پھولے
الٰہی عمر کو ان کی تو اور دراز کرے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

جمیلہ بی بی

Research Scholar, Deptt. of Urdu, Banaras University, Banaras

اَپ ہرن: عصر حاضر کا ایک المیہ

افسانہ وہ صنف ہے جو ہمارے آس پاس کے ماحول سے اپنا مواد اکٹھا کر کے اسے ہمارے ہی اردگرد کے چلتے پھرتے کرداروں کی شکل میں ڈھالتا ہے، انہیں ہمارے دل کی آواز دیتا ہے اور پھر ہمیں ان حقائق سے متعارف کراتا ہے جو ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ دیگر الفاظ میں کہیں تو یہ ہمیں دل کی بینائی عطا کرتا ہے جس سے ہم صرف دل کی نظروں سے ہی دیکھ سکتے ہیں، لیکن یہ ساری چیزیں تبھی تخلیق کے پیرائے میں دوامی ثابت ہو سکتی ہیں جب یہ ہمارے معاشرتی اور سماجی ماحول سے پوری طرح وابستہ ہوں، ورنہ یہ لفظوں کی نمائش کے سوا اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ ایسا اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب ایک فنکار اپنی پینی نظروں سے ان چیزوں کو جانچتا اور پرکھتا ہو اور اسے اپنے تخلیق کے ذریعے زبان فراہم کرتا ہو۔ ہمارے افسانوی ادب میں بہت سے فنکاروں نے اس پر زور آزمائی کی، ان میں کچھ تو بہت آگے نکل گئے اور کچھ پچھڑ گئے۔ آگے نکلنے والوں میں موجودہ دور میں ایک اہم نام عبدالصمد کا بھی ہے۔ انہوں نے افسانوی ادب سے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا اور آج ''دوگز زمین''، ''بکھرے اوراق'' اور ''شکست کی آواز'' جیسے کئی اہم ناول لکھ کر ناول نگاری میں اپنا مقام بلند کیا ہے، لیکن ان کے افسانے کسی بھی معنوں میں دوسرے مشہور افسانہ نگاروں سے کم نہیں۔ ان کا افسانہ ''اَپ ہرن'' اس کا ایک ثبوت ہے جو اپنے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک بہترین افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں محض خیالی باتیں نہیں کی گئی ہیں بلکہ اس میں موجودہ سماج کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

افسانے کے متعلق بات کرنے سے پہلے اس کے عنوان ''اَپ ہرن'' پر ذرا غور کریں تو یہ ہمیں ہزار ہا بار کبھی اخباروں کے پنوں میں دیکھا ہوا تو کبھی ٹی۔ وی چینلوں اور لوگوں کی زبان پر سنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں اپ ہرن کہتے کسے ہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جسے سمجھے بنا ہم اس لفظ کے معنی و مفاہم کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوستان کے تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۶۱ میں لکھا گیا ہے کہ:

> ''جو کوئی کسی نابالغ کو (اگر لڑکا ہو تو سولہ برس سے کم عمر اور اگر لڑکی ہو تو اٹھارہ برس سے کم عمر کے، یا کسی پاگل شخص کو اس کے قانونی نگراں کی خواہش کے بنا) لے جاتا ہے یا بہکا کر لے جاتا ہے وہ شخص اَپ ہرن کا قصوروار تسلیم کیا جائے گا، جس کی سزا دفعہ ۳۶۳ کے تحت سات سال کی مقرر کی گئی ہے۔''

یہ بات بھی صاف طور پر واضح کر دی گئی ہے کہ اس طرح کے گناہ میں ملوث ہونے والا ہر شخص چاہے وہ کوئی بھی ہو گنہگار مانا جائے گا۔ اتنا سخت قانون ہونے کے باوجود بھی اگر اَپ ہرن کی یہ واردات کسی اَن پڑھ، جاہل اور مفلوک الحال دیہاتی کے ساتھ پیش آئے جس میں قانون کا رکھوالا ہی ملزم ہو تو اس کے خلاف وہ اَن پڑھ کیا ردعمل کر سکتا ہے؟ آج بھی یہ سوال ہمارے ذہن میں لگاتار گردش کرتا رہتا ہے کہ ایک غریب شخص کس طرح ایک بڑے عہدے اور رتبے والے شخص کو سزا دلا سکتا ہے۔ انہیں سوالوں کے مدنظر عبدالصمد کا یہ افسانہ ''اَپ ہرن'' بھی تخلیق کیا گیا ہے۔

کہانی کی ابتدا ایک گاؤں کے ڈاک خانے کے بنگلے میں ایک آئی پی ایس حاکم کے ٹھہراؤ سے ہوتی ہے۔ حاکم کے آتے ہی بنگلے کا خانساماں اس کی اور اس کے سپاہیوں کی خاطر و مدارات میں لگ جاتا ہے۔ بنگلے کے قریب ہی بالک رام، اس کی بیوی اور ان کا اکلوتا بیٹا بھوندو بھی رہتے ہیں۔ اسی بالک رام کی دکان سے صاحب اور ان کے

PDF Compressor Free Version

سپاہیوں کا شام کے ناشتے کا انتظام ہوتا ہے۔ بالک رام کی بیوی اپنے بیٹے بھوندو کو گاؤں کے ایک ماسٹر صاحب کے یہاں پڑھنے کے لیے بھیجتی ہے، کیوں کی اس کی یہ خواہش رہتی ہے کہ اس کا بھی بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا صاحب بنے، اس لیے وہ بھوندو کی پڑھائی پر بہت دھیان دیتی ہے۔ ادھر بالک رام صاحب کے آتے ہی بھوندو کے ہاتھوں صاحب کے لیے شام کی چائے اور ناشتہ بھیج دیتا ہے۔ بھوندو بے دلی سے چائے دے کر واپس آجاتا ہے، لیکن صاحب کی اس پر نظر عنایت ہو جاتی ہے۔ بالک رام کو اس سلسلے میں بلایا جاتا ہے۔ بالک رام ڈرتے ڈرتے جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب بھوندو کو اپنے کھانے پینے کے انتظام پر رکھنا چاہتے ہیں۔ بالک رام کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ صاحب کے اس فیصلے سے ایک طرف لالچ اور دوسری طرف بیوی کے ڈر سے تذبذب میں پڑ جاتا ہے، گھر آکر اپنی بیوی کو اس بارے میں بتاتا ہے۔ بیوی بیٹے کی پڑھائی ختم کر کے نوکر بنانے کی بات سے غصہ ہو جاتی ہے آخر کار معاملہ ماسٹر صاحب کے یہاں پہنچتا ہے۔ ماسٹر صاحب ایک ترکیب دیتے ہیں کہ بھوندو پڑھائی کے بعد کھیلنے کے وقت صاحب کے پاس چلا جایا کرے۔ دونوں میاں بیوی اس پر اکتفا کر لیتے ہیں اور شام کو بھوندو کو صاحب کے پاس زبردستی بھیجا جاتا ہے۔

کہانی یہیں سے دوسرا موڑ لیتی ہے کیوں کہ بھوندو اس بار صاحب سے ملنے کے بعد بھوندو سے بھوپندر بن جاتا ہے۔ وہ صاحب کی میٹھی میٹھی باتوں اور کھانے پینے کے لالچ میں آکر اب پڑھائی اور دوستوں کی سنگت چھوڑ کر ہمیشہ صاحب کے پاس ہی رہنا چاہتا ہے۔ اس کے رویے میں اس تبدیلی سے بالک رام کو بھی حیرانی ہوتی ہے، لیکن صاحب کے ساتھ رہنے کو لے کر وہ اندر ہی اندر خوش بھی ہوتا ہے کہ صاحب اس کو ایک نہ ایک دن کوئی سپاہی کی نوکری ضرور دلا دیں گے۔ ایک دن بالک رام اور اس کی بیوی صبح اٹھے تو بھوندو غائب، بنگلے میں جا کر خانساماں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ صاحب تو بھوندو کو لے کر اپنے گھر چھٹی پر گئے ہیں۔ دونوں میاں بیوی بھوندو کے اس طرح بن بتائے چلے جانے پر تڑپ اٹھے۔ ان کو صاحب کے اس رویے پر بہت غصہ آیا، لیکن وہ غصہ بھی کس کام کا جو ظاہر نہ کیا جائے، اب تو صاحب کے آنے کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چھٹی کے بعد صاحب تو واپس آگئے، لیکن بھوندو نہیں آیا۔ مودبانہ گذارش اور ڈرتے ہوئے انداز میں جب بالک رام نے صاحب سے بھوندو کے بارے میں پوچھا تو صاحب نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا کہ مجھے تو لگا کہ بھوپندر تم لوگوں کی مرضی سے میرے ساتھ گیا ہے، خیر اب جب چلا گیا ہے تو اسے وہیں میرے والدین کے پاس ہی رہنے دو۔ وہ وہاں ان کا خیال بھی رکھے گا اور ساتھ ہی پڑھائی لکھائی کر لے گا۔ کم سے کم ایک انسان تو بن جائے گا۔ صاحب سے اتنا سننے کے بعد اس کے اندر اتنی بھی ہمت نہیں رہی کہ وہ بھوندو کے بارے میں کچھ اور پوچھ سکے۔ دل تھام کر واپس چلا آیا اور سوائے رونے اور ہاتھ ملنے کے ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ خانساماں کے کہنے پر یہ دونوں اپنے بیٹے کی حفاظت کے لیے صاحب کی دلجوئی میں لگ گئے۔ آخر کار ایک بار پھر ہمت کر کے بالک رام نے صاحب سے بھوندو کو دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی، لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ اس طرح بیٹے کی تڑپ اور امید بھری نگاہوں کے سامنے ہی صاحب کا دوسری جگہ ٹرانسفر ہو گیا اور وہ چلے گئے، لیکن بھوندو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ سارے گاؤں والوں کو صاحب کے اس رویے پر غصہ آیا۔ ماسٹر صاحب نے اسے آپ ہرن کا کیس کہہ ڈالا، لیکن فوراً ہی اس لفظ کے وزن سے چپ ہو گئے۔ خانساماں کو ترس آیا اور وہ بالک رام کو صاحب کی موجودہ جگہ لے گیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد صاحب سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ صاحب نے بھوندو کو چوری کے الزام میں پولس ریمانڈ میں بھیج دیا ہے۔ بالک رام بلکتے ہوئے واپس گاؤں آگیا۔ ماسٹر صاحب کے علاوہ کچھ لوگوں نے اس سے عدالت سے انصاف مانگنے کی بات بھی کہی، لیکن ایک دیہاتی غریب کسان کو کیا معلوم کہ عدالت سے کیسے انصاف مانگا جاتا ہے۔ آخر کار ایک دن وہ بھی اپنے گھر سے غائب ہو گیا۔ کئی دنوں بعد ماسٹر صاحب نے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ایک دیہاتی نے انصاف مانگتے مانگتے عدالت کی چوکھٹ پر سر پٹک پٹک کر دم توڑ دیا۔ ماسٹر صاحب نے اس خبر کو اپنے پاس ہی محدود رہنے میں بھلائی سمجھی، انہوں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ کہانی یہیں پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

PDF Compressor Free Version

قریب ۴۴ صفحات پر مشتمل یہ کہانی ابتدا میں ہی معنی خیز جملوں سے قاری کو اپنی جانب راغب کرتی ہے۔ مثلاً:

''صدر مقام سے دو تین میل کے فاصلے پر یہ گاؤں تھا۔ جہاں کا خالی، ویران اور وسیع ڈاک بنگلہ صاحب کی رہائش گاہ کے لئے منتخب ہوا تھا اور اتفاق کہ پہلی ہی نگاہ میں انہوں نے اس کے اکلوتے بیٹے کو اپنی سیوا کے لئے چن لیا تھا، لیکن دس برس کا یہ چھوٹا سا کالا کلوٹا، ہنستا کھیلتا، جیتا جاگتا گڈا کتنے سپنوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا، وہ بھلے کمسن تھا، لیکن اس کے آس پاس سپنوں کی جو عظیم عمارتیں کھڑی تھیں، ان کی عمر اس سے کہیں زیادہ تھیں اور انہیں یکلخت زمین بوس کر دینا آسان نہیں تھا۔''

ان جملوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غریب ماں باپ کی امید اور ان کے سہارے کی بیساکھی ان کے بڑھاپے کا سہارا ان کا بیٹا ہے جو ان کی پوری زندگی کی کمائی ہے جس کے بنا ان کا گذارا ممکن نہیں، لیکن صاحب کے گاؤں میں قدم پڑتے ہی بھوندو کی گیند ان کی گاڑی کے نیچے نذر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ ان ٹکڑوں کے ساتھ بھوندو کے معصوم ارمان بھی زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ صحیح معنوں میں بھوندو کے آپ ہرن کی کہانی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ بھوندو جب صاحب کو ناشتہ دے کر واپس آتا ہے تو چپکے سے ان ٹکڑوں کو ہاتھوں میں لے کر اپنے گھر کے طاق میں چھپا دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی ماں سے جدا ہو جاتا ہے تو یہ گیند کے ٹکڑے بھوندو کی یاد بن کر اس کی ماں کے آنسوؤں کو جذب کرتے رہتے ہیں۔ مصنف نے یہاں قاری کو ایک پل کے لیے رک کر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کس طرح ایک گیند کے ٹکڑے خواہشوں اور ارمانوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلے تو ان سے معصوم بھوندو کو انسیت ہوتی ہے، لیکن جب یہی ٹکڑے چپکے سے بھوندو کے ذریعے طاق میں رکھ دیے جاتے ہیں تو وہ اس کی یاد بن کر اس کے ارمانوں اور اس کی یادوں کے ساتھ اس کی ماں کے ارمانوں میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں کہ ایک دن اس کا بیٹا بھی کوئی صاحب بنتا، لیکن اب یہ ارمان ٹکڑوں کی شکل میں اس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں جنہیں چاہ کر بھی وہ جوڑ نہیں سکتی جس طرح بھوندو چاہ کر بھی اسے نہیں جوڑ سکا تھا اور اس نے اسے ہارے ہوئے دل کے ساتھ اس کو طاق میں رکھ دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب یہ گیند کے ٹکڑے نہیں رہ گئے بلکہ صاحب کے ہاتھوں کچلے ہوئے ایک بیٹے اور ماں کے ارمان ہو گئے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو یہ واقعہ بھی ان دونوں کے اپ ہرن کی جانب اشارہ کرتا ہے، مگر افسوس ان ارمانوں کو کچلنے کے بعد بھی صاحب کی جیب اب بھی:

''بے حد رعب کے ساتھ کھڑی تھی اور گیٹ کے پاس ربر کی گیند کے ٹکڑے پڑے تھے۔''

بھوندو کی معصوم نگاہیں اس کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ وہ اپنے باپ سے کہتا بھی ہے کہ اس میں صاحب کا ہی قصور ہے:

'' گاڑی کو روک نہیں سکتے تھے.....؟ آگے تو بیٹھے تھے اور شیشے سے صاف تو دکھ رہا تھا..... میری گیند.....اب میرے ساتھ کوئی نہیں کھیلے گا.....''

یہاں بھی ایک غریب دیہاتی کے اندر صاحب کا رعب اور دبدبہ حاوی ہے اس لیے وہ اپنے بیٹے کی بات پر غور نہیں کرتا۔

قابل غور بات یہ بھی ہے کہ بالک رام کو بھوندو کے صاحب کے ساتھ ہونے پر تسلی تھی کہ صاحب ایک دن اسے ایک سپاہی بنا دیں گے اسے صاحب پر اس قدر بھروسہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو ہی سمجھانے بیٹھ جاتا ہے، لیکن صاحب نے تو اس کے بیٹے کو ایک چور بنا دیا اور اس کو عدالت کی چوکھٹ پر سر پٹک پٹک کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ یہ بھی تو ایک باپ کی امیدوں کا آپ ہرن ہے، حتیٰ کہ اس کی ان باتوں پر بیوی کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی ہے۔ وہ تو ماسٹر صاحب کی ذہانت کی قائل تھی اور انہیں کے لفظوں میں اس کا جواب بھی دیتی ہے اور بحث کرتی ہے، لیکن اس کی ساری تگ و دو لا حاصل ہی رہ جاتی ہے۔ ماسٹر صاحب بھوندو کو اس طرح بنا بتائے لے جانے سے صاحب پر آپ ہرن کا مقدمہ درج کرنے کی بات تو کرتے ہیں، لیکن فوراً ہی چپ ہو جاتے ہیں کہ کس طرح وہ ایک بڑے حاکم سے مقابلہ کریں گے۔ یہ

PDF Compressor Free Version

بھی ایک عام انسان کی ہمت و اس کے حقوق کا آپ ہرن ہی ہے کہ وہ کس طرح ایک بڑے آدمی کے سامنے جھکنے اور اس کے خلاف کچھ نہ بولنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کہانی میں کئی ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان غریبوں کا ایک نئی شکل میں استحصال اور آپ ہرن ہو رہا ہے۔

ان سب کے ساتھ ایک دوسرا پہلو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ذمہ دار اور سماج کا محافظ اپنی بڑائی اور رتبہ و عہدہ کے رعب میں آ کر کس طرح بے حس ہو جاتا ہے۔ اس شخص کو بالک رام اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں ان کے بیٹے کی جدائی کا غم بھی نہیں نظر آتا، ان کے درد اور تڑپ کا اس کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہے۔ وہ کس بے حسی سے بھوندر کو بھوپندر بنا کر اس کا آپ ہرن کرتے ہیں، جب کہ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی نابالغ کو اس کے نگراں کے بنا پوچھے کہیں نہیں لے جا سکتے، تب بھی انہوں نے ایسی حرکت کی، اس لیے کہ ایک غریب، اَن پڑھ دیہاتی کو قانون کی کوئی جانکاری نہیں ہوتی ہے اور جب بالک رام ان سے پوچھتا ہے تو وہ کتنی بے باکی سے کہتے ہیں کہ مجھے لگا کہ وہ تم لوگوں کو بتا کر گیا ہے۔ یہی نہیں وہ ایک مجبور ماں باپ کا استحصال بھی کرتے ہیں۔ بھوپندر کو تو اپنے والدین کی خدمت کے لیے لے ہی جاتے ہیں، ساتھ میں اس کے والدین کو بھی اپنی خدمت میں لگا دیتے ہیں۔ پھر بھی انہیں ذرا سا بھی ترس نہیں آتا ہے کہ وہ کم از کم بھوپندر سے ملنے کے واسطے ان کو اپنے گھر کا پتہ تو دے دیں۔ صحیح معنوں میں وہ ایک ماں باپ سے اس کے بیٹے کو جدا کر کے بالکل ایسے ہی کرتے ہیں جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکال کر اسے تڑپ کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا جائے تا کہ اس سے اپنے پیٹ اور مفاد کی آگ بجھائی جا سکے، حالانکہ کئی بار:

''بالک رام کا جی چاہا کہ گرم گرم چائے کی ٹرے وہ صاحب کے منہ پر دے مارے، لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ تو سانپ ہیں جو اس کے خزانے پر بیٹھے ہیں۔ جب تک وہ خزانہ حاصل نہیں کر لیتا تب تک اسے سانپ کو دودھ پلانا ہی ہوگا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور ٹرے لے کر چلا گیا۔ اس کی بیوی ویران نظروں سے خانساماں، کچن کے در و دیوار اور برتنوں کو گھورے جا رہی تھی۔''

ان چند جملوں میں ایک مجبور ماں باپ کی تڑپ کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سانپ کو دودھ پلانا اور ویران نظروں سے در و دیوار اور برتنوں کو دیکھنا جیسے الفاظ معنی کی کئی پرتیں کھولتے ہیں۔ مجبوری و لاچاری کی یہ کہانی اپنے عروج پر اس وقت پہونچتی ہے، جب:

''کئی دنوں بعد ماسٹر جی نے اخبار کے پچھلے صفحے کے ایک کونے میں خبر پڑھی کہ عدالت کے آہنی گیٹ پر ایک مفلوک الحال نامعلوم دیہاتی نے سر پٹک پٹک کر جان دے دی تو انہیں یقین ہو گیا کہ.....''

یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ بالک رام ہی ہوگا۔ اس طرح عدالت کی چوکھٹ پر ایک غریب دیہاتی کی لاش ہندوستانی قانون و عدالت پر چوٹ کرتی ہوئی ایک اور سوال چھوڑ جاتی ہے کہ یہ کیسا نظام ہے جہاں غریبوں کے لیے کوئی سنوائی نہ ہو؟ کیوں ان کو اپنے قانون کے جال میں پھنسا کر اپنے ہی گیٹ پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے؟ قانون کو کاغذ پر بڑی بڑی دفعات میں باندھ دینے اور پھر اس کو عمل میں لانے پر کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں آپ ہرن کرنے والا شخص ہی قانون کی رکھوالی کرتا ہے۔ یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ اس کے خلاف ایک غریب کسان کوئی مقدمہ درج نہیں کرا سکتا، کوئی کارروائی نہیں کر سکتا اور انصاف کی تلاش میں کچہری کی چوکھٹ پر ہی اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ اس پر سانحہ یہ بھی کہ اس کی موت کا ذمہ دار ہم کس کو ٹھہرائیں ایک حاکم کو، اس کی غربت و جاہلیت کو، یا پھر اس قانون کو جو سب کے لیے مساوی بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماسٹر صاحب بھی ان سارے سوالوں کی تاب نہ لا کر بالک رام کی موت کی خبر کو اپنے تک محدود رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زیر بحث افسانہ فکر و فن کی انگنت تہداریوں کا حامل ہے، ایسے افسانے کم ہی لکھے گئے ہیں۔ اس افسانے پر غور و خوض کے بعد کسی تکلف کے بغیر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ذریعے مصنف نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں ہمارے اردگرد ہو رہے حادثات کو اپنے دل کی گہرائیوں سے نہایت خلوص کے ساتھ محسوس کیا

(بقیہ ص ۱۰۲ پر)

PDF Compressor Free Version

اصغری بیگم

Research Scholar, Bihar Urdu University, Muzaffarpur

شاعر بے نظیر: نظیر اکبر آبادی

نظیر کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ یہ شیخ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۴۰ء کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں کو لے کر اکبر آباد (آگرہ) چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ہر جگہ آگرہ کو ہی اپنا وطن بتاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

نظیر عوامی مزاج کے آدمی تھے عام لوگوں کے بیچ گھل مل کر رہنا انہیں پسند تھا۔ تجربہ بھی وسیع تھا اور مشاہدہ بھی بے حد روشن خیال واقع ہوئے تھے ہندو اور مسلمان دونوں ہی انہیں محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، نظیر کو گانے کا بھی شوق تھا اور کسرت کا بھی، سیر سپاٹے بھی خوب کرتے تھے۔ نظیر نے ایک بھرپور زندگی گزاری گرد و پیش کے ماحول کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور زندگی کے ہنگاموں میں پوری طرح شریک رہے یہاں تک کہا پنی زندگی کے ہنگاموں کو انہوں نے اپنی شاعری میں سمو دیا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عوامی زندگی کی نمائندگی ملتی ہے۔ نظیر کو بجا طور پر ایک مکمل ہندوستانی شاعر کہنا چاہئے۔ احتشام حسین کا یہ کہنا اپنی جگہ بڑی معنویت رکھتا ہے کہ:

''نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کے محل کے اندر ایک چور دروازے کی بنیاد ڈالی اور پہلی دفعہ ہم بادشاہوں، نوابوں اور وزیروں کے ساتھ اردو شاعری کی بساط پر عام انسانوں کو بھی دیکھتے ہیں۔''

ان کی مشہور نظم ''بنجارہ'' کے یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے، دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ دھواں انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے بنجارہ

تو بدھیا لاوے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرا وے گا
دھن دولت، ناتی پوتا کیا، اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر کی نظموں میں ہندوستانی عناصر بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان کی نظموں کے مطالعے سے زمانے کی معاشرت اور سماجی حالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے مسلم تہواروں، عرسوں اور مسلم بزرگوں کے علاوہ میں ہندو تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور ہندو بزرگوں کی شان میں بھی بہت ساری نظمیں لکھیں ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی خارجی دباؤ قبول کئے بغیر اپنے مشاہدات اور محسوسات کو شعر میں سمو دیتے ہیں۔ نظیر کے یہاں حقیقت پسندی اور ارضیت پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے نظم ''آدمی'' کا یہ بند۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

PDF Compressor Free Version

اس بند کے ساتھ ہی ''چپاتی کا فلسفہ'' بھی ملاحظہ فرمائیں اور نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر دور کے معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

گر یہ نہ ہو دو روٹیاں اور ایک پیالہ دال کا
کھیل پھر بگڑا پھرے یہاں حال کا اور قال کا
وصف کس منہ سے کروں میں نان کے احوال کا
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوتے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوتے

نظیر کا مشاہدہ گہرا ہے اور زبان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بات اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی مصور تصویر بناتا ہے برجستگی اور بے ساختگی ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے اس سے ان کی تصویروں میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ نظیر کی نظمیں ''ہولی''، ''دیوالی''، ''آگرہ کی تیراکی'' وغیرہ مرقع نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔

نظیر کی خدمات اردو زبان کے سلسلے میں نہایت قابل قدر ہیں۔ انہوں نے ایسے الفاظ کو مفہوم عطا کیا جن کو دیگر شعرا نے ادنیٰ اور بازاری سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ کمال نظیر کا ہے کہ انہوں نے اردو دنیا کو دکھا دیا کہ بعض غریب، یعنی اجنبی اور گرے پڑے الفاظ میں بھی وہ خوبیاں چھپی ہوتی ہیں جن کو سونے کے ساتھ تولا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظاہر میں نگاہیں وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔

نظیر پر ایک الزام یہ ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے تو ''آب حیات'' میں ان کا تذکرہ کرنا بھی گوارہ نہ کیا، لیکن زمانہ سب سے بڑا منصف ہے، بیشک۔

زمانے کے ہاتھوں سے چارہ نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

زمانے نے ثابت کر دیا ہے کہ شاعری میں رنگ جدید کے پیش رو نظیر تھے۔ فطری اور قومی شاعری کی ابتدا آزاد اور حالی سے نہیں بلکہ نظیر اکبر آبادی سے ہوتی ہے۔ یہ نظیر ہی تھے جنہوں نے ایک ایسی طرز کی بنا ڈالی جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی اور ہمارے قومی احساسات کی نمائندگی کا سبب بنی۔ نظیر کی غزلیہ شاعری بھی اپنے اندر ایک الگ بانکپن رکھتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دور سے آئے تھے من کر پتر ے بے جانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے، مینا بھی ہے، شاعر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

اور اسی غزل کا یہ شعر بھی سن لیں جو ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

مدعا یہ کہ نظیر اپنی خصوصیات اور زبان وادب کی خدمات کے اعتبار سے خاک ہند کا بے نظیر شاعر تھا۔ نظیر کے یہاں کبیر کے اخلاق اور خسرو کی ذہانت کا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو تغزل سے ہٹ کر نظمیں لکھنے کی نظیر نے کی ابتدا ہی نہیں انتہا بھی کر دی، لیکن شاید وہ وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے، غالب کی طرح یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں اور کافی بعد تک ان کی شاعری کا اعتراف کی منتظر رہی، مگر آج فضا بدل چکی ہے اور زمانہ نظیر کو شاعر بے نظیر کہنے پر مجبور ہے۔

کام کی باتیں

☆ اندھا اعتقاد بربادی ہے اور محض نکتہ چینی بدنصیبی
☆ ترقی کی بنیاد خارجی نہیں، داخلی ہوتی ہے
☆ بچوں پر پیار آنا اللہ کی رحمت کا نشان ہے
☆ عقلمند وہ ہے جو دوسروں کو بیوقوف نہ سمجھے
☆ وقت سے پہلے کبھی اپنے ارادے کا اظہار نہ کرو
☆ جسے ہار جانے کا خوف ہو، وہ ضرور ہار جائے گا
☆ خوش اخلاقی سب سے اچھا جوہر ہے
☆ ہمارا علم ہمارے اعمال سے جھلکتا ہے
☆ دل کا سکون صرف اور صرف سچائی سے ملتا ہے
☆ لوگوں پر ظلم نہ کرنا بھی سخاوت ہے

PDF Compressor Free Version

ناولٹ

ذکیہ مشہدی

F1, Grand Pallavi Court, Judges Court, Patna 800004

پارسابی بی کا بگھار

''تو جب وہ بی بی دال بگھارتی تو زیرے، لہسن اور اصلی گھی کی سوندھی خوشبو اڑ کر سات آسمانوں تک پہنچتی اور فرشتے کہتے: لو آج پھر پارسابی بی کے گھر ارہر کی سنہری سنہری دال پکی ہے۔ پارسا بی بی بیٹی تو تھی بادشاہ کی، لیکن بیاہ کے آ گئی تھی غریب منشی کے گھر۔''

دادی تو یہ کہانی صدیوں سے سناتی آ رہی تھیں، لیکن کبھی کسی بہو نے ان سے یوں منھ لگ کر سوال نہیں کئے تھے۔ رہی بات قمر کی تو وہ بہو نہیں، پوتی تھی اور طرہ یہ کہ اسکول پڑھنے جاتی تھی۔ اوپر سے ککڑی کی بیل کی طرح دھڑا دھڑ بڑھ رہی تھی۔ اس نے پٹ سے سوال کیا:

''بھلا بادشاہ زادی بیاہ کے غریب منشی کے گھر آئی کیسے؟''

دادی اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''بتایئے نا دادی! ایسا ہوتا ہے کہیں؟ اب بادشاہ زادی بیاہ کے بادشاہ کے گھر جائے نہ جائے، نواب کے گھر تو جائے ورنہ سپہ سالار، وزیر، کچھ تو ہو۔''

''کہانی سنے گی یا بال کی کھال نکالے گی؟ کٹ حجت کہیں کی! اور پڑھاؤ اسکول بھیج کے اور وہ موئی کرسٹان استانیاں.....''

دادی بگڑ گئیں۔

ماتھے سے سرکتا آنچل پھر سے اچھی طرح جما کے اماں نے بھی تنبیہ کی: ''کتنی بار سمجھایا، بڑوں سے حجت نہیں کرتے ہیں۔''

''اور اگر بڑے ایسی باتیں کریں جو سمجھ میں نہ آئیں تو؟''

قمر نے نصیحت یکسر نظر انداز کر دی۔ اس کی محبوب ٹیچر مسز نارٹن نے، جنہیں دادی ''نانگ'' بلکہ ''نوٹنکی'' کہا کرتی تھیں، سمجھایا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لینا چاہئے، گفتگو سے ذہن کے دروازے کھلتے ہیں۔

''اچھا چل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو سمجھ ہی لے، کیونکہ اس میں نصیحت بھی ہے۔ بادشاہ زادی کوتوال کے بیٹے سے.....'' دادی کی زبان ذرا رکی، ذرا لڑکھڑائی لیکن پھر سنبھالا لے لیا۔

''بادشاہ زادی کوتوال کے بیٹے سے آنکھ مٹکا کر کے بیٹھی تھی، اس لئے سزا دینے کے لئے بادشاہ نے اسے، جو پہلا لڑکا نظر آیا، اس سے بیاہ دیا۔ اب وہ نکلا منشی کا بیٹا اور منشی کی مجال جو بادشاہ کے حکم سے سرتابی کرے۔''

''دادی، منشی کے بیٹے سے کوتوال کا بیٹا تو اچھا رہتا نا!''

''اوئی بی بی! یہ لڑکیاں اپنا بر کب سے خود چننے لگیں؟ ایسی بیٹیوں کو تو گلا دبا کے مار دینا چاہئے۔ اللہ آمین کی بیٹی رہی ہوگی، سو بادشاہ نرم پڑ گیا۔ زندہ رہنے دیا ایسی بیٹی کو۔''

''اچھا تو دادی، اگر کیا کہتے ہیں کہ اس نے اپنا بر خود چننے کا گناہ کیا تھا تو وہ پارسابی بی کیسے کہلائی؟''

''پارسابی بی اس لئے کہلائی کہ اس نے سر جھکا کر باپ کی مرضی کو قبول کر لیا، پھر شوہر کے علاوہ کسی کو آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ جس کے چاروں طرف لونڈی غلام ہاتھ باندھے گھومتے تھے وہ جھاڑو بہارو کرتی، گائے کی سانی پانی کرتی، کھانا پکاتی اور جب دال بگھارتی تو.....''

کہانی کے اس موڑ پر دادی نے ڈرامائی انداز میں گھوم کر فاطمہ بی بی یعنی قمر کی اماں یعنی اپنی بہو کی طرف دیکھا اور آواز قدرے تیز کر دی:

''اور جب وہ دال بگھارتی تو ایک بڑے پیالے میں شوہر، سسر اور بیٹے کے لئے دال نکال کر بگھار کر پورا کر چھل اس پیالے میں انڈیل دیتی اور اپنے لئے پتیلی کے پیندے میں چھوڑی ہوئی تھوڑی سی

PDF Compressor Free Version

دال میں خالی کر چھل ڈبو دیتی۔ گرم کر چھل چھن سے کرتا اور دراصل یہی چھنا کا اس کے گھر کے روشندان سے ہو کر آسمانوں تک پہنچتا اور فرشتے کہتے کہ لو، آج پھر پارسا بی بی نے ارہر کی سنہری سنہری دال پکائی ہے۔"

"اچھا تو دادی" قمر نے پھر لقمہ دیا، "اگر وہ لوگ اتنے غریب تھے تو خالص گھی میں دال کیسے بگھاری جاتی تھی؟"

دادی نے ناک بھوں چڑھائی۔ "یہ مٹ گیا ڈالڈا تو ابھی حال میں نکلا ہے۔ پہلے معمولی گھروں میں بھی دال گھی سے ہی بگھاری جاتی تھی۔ گھی کم ہونے کی وجہ سے ہی تو پہلے مردوں کے پیالے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ پہلا حق تو ان کا ہی ہوا نا!"

"ان کے گھر کبھی گوشت پکتا تھا دادی؟" قمر کو گوشت بہت پسند تھا اس لئے اس نے بڑے تاسف سے پوچھا۔

"ہاں، ہفتے کے ہفتے پکتا تھا۔"

دادی نے یوں کہا جیسے وہ پارسا بی بی، بادشاہ زادی، ان کی بھانجی بھتیجی کچھ تھی اور وہ اس کی گرہستی میں رہ آئی تھیں۔

"پارسا بی بی، گوشت پکا کر پورا سالن بڑے چینی کے پیالے میں انڈیل کر گھر کے مردوں کے سامنے رکھ دیتی اور خود روٹی سے پتیلی پونچھ لیتی۔ کبھی آلو یا اروی گوشت میں ڈالتی تو ہاں اس کا ایک آدھ ٹکڑا اپنے لئے روک لیا کرتی۔"

"ہا، دکھیا!"

قمر نے ناک پر انگلی رکھ کر بالکل دادی کے انداز میں کہا۔

"ارے دکھیا کیوں؟ کھڑی جنت میں گئی۔ جب مری تو سارا گھر خوشبو سے مہک رہا تھا۔"

"آپ نے خوشبو سونگھی تھی، دادی؟"

اماں اس درمیان اٹھ کر، کہ وہ یہ کہانی دسیوں بار سن چکی تھیں، باورچی خانے میں مردوں کے پیالے میں پورا بگھارا انڈیلنے جا چکی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے کر چھل بہک گیا۔ خیریت تھی کہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ قمر ضرور کسی دن مار کھائے گی۔ ان کا آنچل پھر سر کنے لگا۔ کر چھل اور آنچل دونوں سنبھال کر وہ تاسف کے ساتھ قمر کے مستقبل پر غور کرنے لگیں جو خاصا تاریک نظر آ رہا تھا۔ اس قدر بک، بک، اتنی جبت۔

باسی کھانا اکثر اماں ہی سوارت لگاتی تھیں۔ گھر میں کوئی خاص چیز پکتی تو بچا کر مردوں کے لئے رکھ دیتیں کہ دوسرے وقت بھی کھا لیں گے۔ خود کبھی پہلے کے بچے کھچے کے لئے برتن ٹٹولتیں۔ نہیں تو اچار ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ اکثر انہیں باسی کھاتے دیکھ کر قمر ہاتھ سے رکابی چھین لیتی اور تازہ کھانا ان کی پلیٹ میں ڈالتی۔

"کھانا پھینکنا کبھی نہیں چاہیے بیٹا، گناہ ہوتا ہے۔"

وہ کہتیں۔

"تو سب مل کے کھائیں۔ ابا کو اور بھیا کو اور دادی کو، سب کو دیا کرو تھوڑا تھوڑا۔"

اماں مسکراتیں۔ "دادی اپنے وقت میں بہت باسی کھا چکی ہوں گی۔ اب وہ گھر کی بزرگ ہیں۔"

"جھوٹن کھانا رہ گیا ہے، وہ بھی تم کھا لیا کرو۔"

ایک دن قمر نے جلبلا کر کہا تھا۔ اس دن ابا نے اپنے کچھ دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ باہر سے برتن آئے تو کچھ پلیٹوں میں بہت کھانا بچا ہوا تھا۔ اماں نے اسے سمیٹ کر اکٹھا کیا اور بھیا سے کہا کہ باہر ڈال دے، کتا کھالے گا۔

"کوڑے میں مت ملانا، صاف جگہ پہ رکھنا۔"

انہوں نے بیٹے کو ہدایت دی۔

"کتا کیوں کھائے گا؟ تم کھالو۔ مرغ کی دو دو بوٹیاں ہیں، اچھا خاصا پلاؤ ہے۔ یہ ابا کے پیٹ بھرے دوست نیاز خاں، گھر میں حرام کا بہت آتا ہے، اس لئے برباد کرتے جی نہیں دکھتا۔"

اماں نے سر پہ ہاتھ مار لیا: "ارے کم بخت لڑکی! باہر آواز جائے گی۔ ذرا دھیرے بول، جو منہ میں آتا ہے، بک جاتی ہے۔"

اماں کو یہ خدشہ ہر وقت لگا رہتا تھا کہ آواز باہر جائے گی۔ ایک دن دادی نے ابا سے جانے کیا لگائی بجھائی کی کہ وہ خوب چلائے۔ اماں کو یہ رنج کم تھا کہ ابا بغیر معاملے کی تحقیق کیے ان پر چلائے تھا، یہ فکر زیادہ لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں آواز باہر نہ گئی ہو اور پاس پڑوس والوں یا کسی راہ چلتے کو پتا نہ چل گیا ہو کہ اس گھر میں کوئی چپقلش ہوئی ہے، لیکن یہ قمر سن کے ہی نہیں دیتی تھی۔ پرائی امانت، کہاں جائے گی تتیا مرچ؟

PDF Compressor Free Version

''ہاں تو دادی، تم گئی تھیں جب پارسا بی بی مری تھی؟''

دادی بڑے زور سے بھڑکیں:

''ہر بات خود دیکھی جاتی ہے کیا؟ ارے خدا کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے! یہ کہانی ہمیں ہماری جنت مکانی والدہ نے سنائی تھی۔ ہوسکتا ہے کسی نے پارسا بی بی کو دیکھا بھی ہو۔''

''نہ دیکھا ہو تو ہماری اماں کو دیکھ لے۔ یہ کون سا پارسا بی بی سے کم ہیں۔'' قمر کا انداز چڑانے والا تھا۔

''تیری اماں'' انہوں نے گھور کر پوتی کو دیکھا، پھر ایک خشمگیں نظر سر جھکائے باورچی خانے میں کام کرتی بہو پر ڈالی۔ (باورچی خانہ آنگن پار کر کے برآمدے کی سیدھ میں تھا جہاں دادی کا تخت پڑا رہتا تھا۔ قمر اسے 'راج سنگھاسن' کہتی تھی۔ وہاں سے کوئی آیا گیا، بہو، نوکر، سب دادی کی نظر میں رہتے تھے۔)

''تیری ماں ذرا تجھ پارسا بی بی کو تو سنبھال لے۔ چل، ادھر آ۔ یہ مٹ گئے عیسائیوں کی سی وضع بنا رکھی ہے۔''

انہوں نے قمر کی دو چوٹیوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''یہ تیری عالم فاضل ممانی آ کر تجھے سکھا گئی ہے۔''

اماں سے ملنے آئی ممانی قمر کے گھنے بال سلجھانے میں مدد کر رہی تھیں تو قمر نے ٹھنک کر کہا تھا کہ اسکول میں زیادہ تر لڑکیاں دو چوٹیاں بنا کر آتی تھیں۔ بس، مارے لاڈ کے ممانی نے دو چوٹیاں بنا کر سرخ ربن سے پھول بھی بنا دیا۔ تھاپی جیسی ایک چوٹی سے وہ دو چوٹیاں کیسی اچھی تھیں۔ اماں سارے طعنے، سارے کہانیاں شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی تھیں، بس میکے کے بارے میں بڑی حساس تھیں۔

''ہمارے وقت میں لڑکیوں کو مانگ نہیں نکالنے دیتے تھے۔ بغیر مانگ نکالے ایک چوٹی بندھا کرتی تھی، اب وہ تھاپی لگے یا نیولے کی دم۔ (قمر اپنی موٹی چوٹی کو 'نیولے کی دم' کہا کرتی تھی) تو بیٹا، تمہیں تو مانگ نکالنے کی اجازت ہے، کیوں دو چوٹیوں کی ضد کر کے دادی سے ڈانٹ سنتی اور ممانی کو برا کہلواتی ہو؟''

اماں کے لہجے میں تاسف تھا۔

''دو چوٹیاں باندھنے سے کسی کے مذہب کا کیا لینا دینا؟ مجھے بڑا غصہ آتا ہے جب دادی کہتی ہیں کہ عیسائیوں کی سی وضع بنا رکھی ہے۔'' (دادی کے 'مٹ گئے' عیسائی اس وقت بھی ساری دنیا پر دندنا رہے تھے، جیسے آج دندنا رہے ہیں اور جس کو چاہتے تھے اسے مٹانے کا مقدور رکھتے تھے، جیسے آج رکھتے ہیں۔ نہ جانے کتنی تہذیبوں کو کتنی حکومتوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا، لیکن قمر کا شعور اس وقت اتنا بالیدہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں، یہ سمجھتی تھی کہ اس کی دو چوٹیوں سے عیسائیوں کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔)

قمر نے امتیازی نمبروں سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد بی۔ایڈ میں داخلہ لیا تو اس نے اپنے بال کٹوا دیے۔ وجہ یہ تھی کہ پریکٹس ٹیچنگ کے لئے جوڑا بنا کر جانا لازمی تھا۔ جن لڑکیوں کے بال تراشے ہوئے تھے ان پر یہ ضابطہ لاگو نہیں تھا۔ کم عمر قمر کے لئے جوڑا بنانا، وہ بھی گھنے روکھے بالوں سے ٹیڑھی کھیر تھا۔ ویسے تو یہ بی۔ایڈ نہایت ٹیڑھی کھیر تھا۔ بچے بڑے شاطر تھے۔ انہیں معلوم تھا یہ لڑکیاں ان کی اصلی ٹیچر نہیں ہیں، یہ تو موسمی پرندے ہیں جو چند ماہ کے لئے ایک مخصوص مدت میں آتے اور پھر اڑ جاتے ہیں، اس لئے قطعی بات نہ سنتے۔ اگر سپروائزر سے شکایت کرو تو وہ جواب دیتے کہ بچوں کو ڈسپلن کرنا آپ کی تربیت کا حصہ ہے۔ آپ سمجھئے، آپ کیا کریں گی۔ ایسے میں بال اور لباس درست رہنا بہت ضروری تھا۔ چھٹیوں میں قمر گھر آئی تو اماں نے سر پیٹ لیا۔ خیریت تھی کہ اس وقت دادی جنت مکانی خلد آشیانی ہو چکی تھیں، اس لئے سر اماں نے اکیلے ہی پیٹا۔ بی۔اے کے بعد، بلکہ اور پہلے سے، دادی نے تو قمر کی شادی کی ضد باندھ رکھی تھی۔ اس وقت انہیں صرف ایک منطق نے چپ کرایا تھا۔ قمر پڑھ لکھ کر پیروں پر کھڑی ہو جائے گی تو بغیر جہیز کے آسانی سے 'اچھا' لڑکا مل جائے گا، پھر استانی بننا تو عزت کی بات ہے۔ وہ کرسٹان مسز نارنگ کی بٹیا سلوی کی طرح آفس میں ٹپ ٹپ ٹائپ کرنے تھوڑی ہی جا رہی ہے۔ دادی قمر کے استانی بننے سے پہلے چل بسیں، لیکن کچھ معاملوں میں اماں کون سی کم تھیں، وراثت سنبھالے بیٹھی ہوئی تھیں۔ جبھی تو قمر کے بال دیکھ کر اس قدر ہول گئیں کہ انہوں نے پہلی بار شوہر کو کٹگھرے میں کھڑا کرنے کی ہمت کی جوان کے لئے مجازی

PDF Compressor Free Version

خدا کا درجہ رکھتے تھے اور جن پر یہ الزام تراشی کفر تھی۔ ویسے بھی اماں نیک اور فطرتاً ڈرپوک انسان تھیں، اپنے وقت کی زیادہ تر شریف بیبیوں کی طرح، جن کا بیاؤ عموماً اسی وقت کھلتا جب وہ ادھیڑ عمر ہو کر ساس کے مرتبے پر فائز ہو جاتیں اور ایک انہی کی طرح کی کمزور لڑکی بہو بن کر گھر میں آجاتی، لیکن اس دن انہوں نے بڑی ہمت کی، شوہر کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئیں:

''قمر کو آپ نے بگاڑا ہے۔ بی۔اے کر لیا تھا، بہت کافی تھا۔ سلمان چچا اتنا اچھا رشتہ لائے تھے، آپ نے میرے اصرار کے باوجود انکار کر دیا اور لڑکی کو بھیج دیا بی۔ایڈ کرنے، پھر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کیا کرتی گھوم رہی ہے۔''

''کیا کرتی گھوم رہی ہے؟'' ابا نے چونک کر آخری جملہ پکڑا۔ باقی باتیں صفا ٹال گئے۔

''بال کٹوا لیے ہیں اس نے۔'' اماں کا لہجہ ایسا مضطرب تھا جیسے کانے دجال کے نکل آنے کی اطلاع دے رہی ہوں۔

''اوہ!'' ابا کی رکی ہوئی سانس سینے سے باہر آ گئی۔ وہ بڑی زور سے کھٹکے تھے۔ انہیں لگا تھا بیوی خبر دیں گی کہ بیٹی کسی لونڈے کے ساتھ گھومتی دیکھی گئی ہے، اس لئے 'میموں' جیسے بال کٹوا لینے کی خبر خاصی دلدوز ہونے کے باوجود اپنا اثر کھو بیٹھی تھی۔ زور کا جھٹکا دھیرے سے لگا۔

''اچھا! لیکن میں نے تو نہیں دیکھا'' ابا کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید قمر کی اماں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا وہ کچھ مبالغے سے کام لے رہی ہیں، لیکن ان کی آواز کمزور ضرور تھی۔

''آپ کے سامنے آپ کی چالاک بیٹی سر ڈھکے رہتی ہے۔ سر کھلا رکھتی ہے تو پیچھے کلپ لگا کر بال سمیٹ لیتی ہے۔''

ابا کے اجلاس میں قمر کی طلبی ہوئی تو اس نے بغیر کسی گھبراہٹ کے وضاحت پیش کی۔ ابا کو یہ اطمینان ضرور ہوا کہ قمر نے بال محض فیشن ایبل لگنے اور 'میموں کی وضع' اختیار کرنے کے لئے نہیں کٹوائے ہیں۔

''بی۔ایڈ کا کورس ختم ہونے میں بس دو مہینے باقی ہیں۔ امتحان ہو جائیں تو پھر بڑھا لینا۔''

ابا نے تحکمانہ، لیکن نرم لہجے میں اتنا ہی کہا۔

''جی ابا، ضرور'' قمر نے منمنا کر جواب دیا، لیکن ان کے باہر چلے جانے کے بعد اماں پر الٹ پڑی:

''چغلی لگا کے کیا ملا تمہیں؟ لڈو؟''

''خوب تعلیم ہے بھائی تمہاری۔ خاندان میں اور لڑکیاں نہیں ہیں کیا؟ اور کسی نے نہ کٹوا لیا چونڈا!؟''

ابا نے قمر کی خاطر خواہ سرزنش نہیں کی تھی، اس لئے اماں آزردہ خاطر تھیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی جارہی تھیں ''......اسکولوں کالجوں میں یہی سکھایا جا رہا ہے کہ بڑوں سے بدتمیزی کرو؟ اب یہی تم اپنے شاگردوں کو سکھانا۔ رہ گئے تمہارے ابا، تو بسنت کی خبر نہیں۔ کون کرے گا پرکٹی سے بیاہ؟''

ایک تو 'چونڈا کٹواتے' جیسا غیر فصیح، اہانت انگیز جملہ، اوپر سے جلے پر نمک، 'پرکٹی' پھر خاندان کی دوسری غبی، کند ذہن، گھر بیٹھ کر پرائیوٹ اردو فارسی کے امتحان پاس کرنے والی لڑکیوں سے موازنہ —— قمر کی ایڑی میں لگی اور چوٹی میں بجھی۔ جلبلا کر بولی:

''اور اسے بھول گئیں، وہ تمہارے چچازاد بھائی کی بیٹی ثریا۔ اس نے بال کٹوائے ہی نہیں بلکہ لکھنؤ جا کر ان میں گھونگھرو بھی ڈلوائے۔ یہ نہ کہنا کہ تمہیں معلوم نہیں۔ ابھی تو ملی تھی فرزانہ خالہ کے یہاں میلاد میں۔''

''ثریا کی شادی ہو گئی ہے۔ اب وہ جانے اور اس کا شوہر اور سسرال والے اور ہاں، میرے چچازاد بھائی تمہارے ماموں ہوئے۔ خبردار جو یوں ذکر کیا ہے کہ تمہارے چچازاد بھائی۔''

''ہاں ہاں، چلو نا! بڑے آئے ماموں۔ ایک نمبر کے تگڑم باز، معمولی صورت کی بارہویں پاس بیٹی کے لئے سرکاری نوکری والا لڑکا لے آئے۔ تم نے بھی کر دی ہوتی ہماری شادی، پھر بلا سے ہم سر ہی مونڈ کر رکھ دیتے۔ شادی نہ ہوئی، ہر آزادی کا پروانہ ہو گئی۔''

قمر پیر پٹختی وہاں سے چل دی۔

اماں، ٹک ٹک دیدم نہ کشیدم، بت بنی بیٹھی دیکھتی رہ گئیں۔ ایسی خاموش ہوئیں کہ سارا دن گزر گیا اور وہ ہوں ہاں کے علاوہ کچھ

PDF Compressor Free Version

نہ بولیں۔ کتنی بڑی بات بول گئی یہ بدزبان لڑکی! تم نے بھی کر دی ہوتی ہماری شادی، اگر قمر کے ابو نے سلمان چچا کا لایا ہوا رشتہ منظور کر لیا ہوتا تو آج یہ سننے کی نوبت نہ آتی۔ اچھے بھلے لوگ تھے، اچھا خاصا رہن سہن، معقول لڑکا۔ یہی نا کہ خاندان بڑا لانجا چوڑا تھا۔ میری بیٹی قمر اس چڑیا خانے میں پندرہ بیس لوگوں کی روٹی ٹھوکنے نہیں جائے گی۔"

ابا نے ایک حتمی جواب دیا تھا اور پھر کیا مجال جو کوئی ان سے ہامی بھروالے۔

"خاصہ پیسہ ہے، لیکن گھر میں نوکر چاکر نہیں۔ بس جھاڑو برتن کے لئے ایک عورت آتی ہے، باقی کام خواتین خود کرتی ہیں۔ گاڑی بھر تو برتن نکلتے ہیں۔ اگر ملازمہ نے ناغہ کیا تو وہ بھی خود ہی دھوتی ہیں، پھر یہ کہ لڑکے کی عمر بھی زیادہ ہے۔"

امیرن خالہ نے بتایا تو پھر دادی خاموش ہو گئیں، گرچہ قمر کا اٹھارہواں سال لگتے ہی انہوں نے اس کی شادی کے لئے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔

اماں اس دن چپ چاپ بیٹھی خلا میں کچھ دیکھتی رہیں۔

پندرہ بیس تو نہیں لیکن دس بارہ لوگ گھر میں ضرور تھے۔ جب سترہ برس کی کامنی سی اماں بیاہ کر آئی تھیں۔ ابا کے والد حیات تھے۔ تین بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ ایک ایئر پورٹ میں نوکر تھے۔ ان کی بس علی الصباح آتی تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں ان کا ناشتہ بنتا تھا اور ساتھ لے جانے کے لئے لنچ بھی۔ اماں کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا۔ دادی اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹتی پڑی سناتی رہتیں، گرچہ اس وقت بڑی مضبوط قد کاٹھی کی محض ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔

اس وقت کوئی نہ گیس چولہا جانتا تھا، نہ پریشر کوکر۔ رات کا کھانا سب ساتھ کھاتے تو اماں کوئی تیس پینتیس چپاتیاں بنا کر اٹھتیں۔ چولہے کی آنچ سے چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔ سب کو کھلا کر خود کھانے کے بعد باورچی خانہ بند کر کے وہ دادی کے پیر دبا کر سونے کے لئے اپنے کمرے میں آتیں تو رات کے گیارہ بج رہے ہوتے تھے۔ اکثر تو ابا انہیں سوتے ہوئے ملتے۔ وہ خاموشی سے، کہ کہیں شوہر کی نیند نہ کھل جائے، ایک کونے میں سکڑ سمٹ کر لیٹ جاتیں۔

قمر کے ابا، کیا تم نے کبھی سوچا کہ میں بھی کسی کی بیٹی تھی؟

دریبر کی بی بی صبح لوہے کا کرچھل لے کر آگ مانگنے کو آئیں (اور کچھ آگ لگا بھی گئیں)

"اے ہے، ابھی تک چولہا نہیں سلگا، دریبر کی بی بی؟" اماں نے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

"کل سانجھ کے یہ دیر سے لوٹے۔ سودا سلف کچھ نہیں آیا تھا۔ ابھی جا کے آلو لے کے آئے، تیل لے کے آئے۔ سبیر۔ سبیر۔ کو نو دکان نہیں کھلی رہی۔"

انہوں نے وضاحت پیش کی۔ اماں سمجھ گئیں۔ رات ڈرائیور نے پھر پی ہوگی۔ گھر میں دانتا کل کل بھی ہوئی ہوگی۔ کیا پتہ دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دیے ہوں۔ رمضانی بوا نے چولہے میں لکڑیاں جھاڑ کر کچھ انگارے گرائے، ساتھ ہی پوچھا:

"چائے پیوگی، دریبر کی بی بی؟"

دریبر کی بی بی کے میاں نے کبھی کسی زمانے میں ایک انگریز کی جیپ چلائی تھی۔ انہیں فوری بھرتی کے تحت ٹریننگ دی گئی تھی۔ بہت مہارت حاصل نہیں ہو پائی تھی۔ کچھ اول جلول تھے بھی۔ ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا تو نکالے گئے اور اپنے خاندانی پیشے یعنی چوڑی بیچنے پر واپس آ گئے۔ وہ ذات کے منہیار تھے، لیکن ان کے نام سے "دریبر" چپکا تو بس چپکا ہی رہ گیا۔ انہیں بڑا فخر بھی تھا، انہوں نے گورے صاحب کی گاڑی چلائی تھی۔ ان کی اہلیہ 'دریبر کی بی بی' کہلانے لگی تھیں، سو کہلاتی رہیں۔ شوہر جب گاڑی چلاتے تھے اس وقت بھی وہ خاص خاص گھروں میں جا کر چوڑی پہنا آیا کرتی تھیں۔ ان کی چھوٹی سی ناک عموماً چڑھی ہی رہا کرتی تھی۔ خاصی خوبصورت خاتون تھیں اور اپنی خوبصورتی (اور میاں کی بد صورتی) کا انہیں پورا احساس تھا، گرچہ ان کی خوبصورتی بھول کر اکثر دریبر صاحب نشے میں انہیں اچھی طرح دُھن دیا کرتے تھے۔

رمضانی بوا کی چائے کی پیشکش خاصی قابل اعتنا تھی۔ "پی لیں گے" انہوں نے بڑے فخر سے جواب دیا، جیسے چائے پی کر بوا پر احسان کریں گے۔

PDF Compressor Free Version

بوا نے اپنا تام چینی کا تاملوٹ اسی وقت چائے سے بھرا تھا۔ اس میں سے کچھ چائے ایک چھوٹی پیالی میں ڈال کر پیالی پرچ میں رکھ کر دریبر کی بی بی کو بڑھا دی۔ انہوں نے چائے پرچ میں نکال کر سڑپ سڑپ کر کے پی لی۔ رمضانی بوا نے دہکتے انگارے کر چھل میں ڈالے اور کر چھل انہیں تھما دیا۔ وہ کر چھل پر پھونکیں مارتی، انگنی ساری کا پلو سر پر سنبھالتی، سٹر پٹر دروازے کی طرف بڑھیں، لیکن پھر یکا یک پلٹیں۔

''چلتے ہیں باجی'' انہوں نے اماں کو مخاطب کیا۔

''اب جلدی بیٹا کے ہاتھ پیلے کرو تو ہم چوڑی کا ٹوکرا لے کے آئیں۔ اب کسی کے یہاں نہیں جاتے، مگر آپ کی بات دوسری ہے۔ کب سے آسرا لکھ رہے ہیں۔ (انہوں نے 'کب سے' پر خاصا زور دیا تھا) کب ختم ہوگی بٹیا کی پڑھائی؟ اچھا سلا مالیکم''

وہ سلا مالیکم تک پہنچتے پہنچتے دروازے سے باہر ہو چکی تھیں اس لئے سلام بھی ذرا زور سے ادا کیا، جیسے پتھر کھینچ مارا ہو۔

''بڑی آئیں خیر خواہ!'' رمضانی بوا نے چائے تو پلا دی تھی، لیکن دریبر کی بی بی کی دریدہ دہنی انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

''دیکھئے نا باجی، جتا رہی تھیں، بٹیا اتنا پڑھ لکھ گئیں اور اب تک شادی بیاہ کی سن گن نہیں ہے۔ 'کب سے آسرا لکھ رہے ہیں۔' ارے آسرا تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں، مگر ہم کچھ بولتے ہیں کیا؟ وہ بھی ایسے!''

اماں کے جلے پر نمک پڑ گیا۔ اندر ہی اندر تلملا گئیں۔ محلے میں لوگ دو دو تین تین بیٹیاں بیاہ چکے تھے، یہاں ایک کا نصیب کھلنے میں اتنی دیر..... اور پڑھاؤ جتنا پڑھیں گی اتنا ہی لڑکا ملنا مشکل ہوتا جائے گا۔

پگلی مہترانی آنگن بہار رہی تھی۔ وہ دریبر کی بی بی کے نکلنے کے بعد داخل ہوئی تھی۔ بات بدلنے کو اماں نے اسے بلاوجہ پکارا، ''بہو، دیکھو ذرا ٹھیک سے جھاڑو لگانا۔ پت جھڑ آ گیا ہے، چاروں طرف پتے اڑتے پھر رہے ہیں۔ قمر.....'' انہوں نے قمر کو بھی آواز دی:

''دیکھو، ذرا نالی دھلوا دینا۔''

خاصے بڑے آنگن میں امرود کے دو نوجوان درخت تھے اور نیم کا پرانا جغادری پیڑ۔ اس کے علاوہ لسوڑہ اور انجیر بھی لگے ہوئے تھے۔ لسوڑے کا کوئی مصرف نہیں تھا، سوائے اس کے کہ محلے والے اچار کے لئے مانگ لے جائیں، لیکن اماں اسے کٹوانے کو تیار نہیں تھیں۔ انجیر گھر میں کوئی نہیں کھاتا تھا، سوائے اماں کے۔ نیم کی ہوا بیماریاں دور کرتی ہے اور انجیر صحت کے لئے مفید ہے، خشک لسوڑے کی چائے آنتوں کے لئے فائدہ مند تو تھی ہی، ساتھ ہی خشک کھانسی بھی دور کرتی تھی۔ اس معاملے میں اماں کسی کی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ حجت نہیں کرتی تھیں، بس خاموش ہو جاتیں۔ ان کی ناراضگی، ناراضامندی اور دل گرفتگی سب کے اظہار کا ایک ہی ذریعہ تھا — ایک پھرائی ہوئی خاموشی۔

قمر کی کل کی بات کے بعد بھی وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ ابھی جو انہوں نے اسے مخاطب کیا تو اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اسے اماں کی خاموشی سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ بولتی ہیں تو گھر میں ماحول نارمل اور خوشگوار لگتا ہے۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا قمر نے کہ انہیں چپ لگ گئی تھی؟ اس نے بالٹی میں پانی بھرا اور آنگن کے کنارے کنارے لمبائی میں گزرتی نالی میں ڈال کر نالی پگلی سے دھلوائی، پھر اماں کے پاس آ کر ان کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے:

''اماں، ہم کل الٰہ آباد واپس جا رہے ہیں۔ تم کو ناراض چھوڑ کر کیسے جائیں؟ تم ہم سے بات نہیں کر رہیں۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''بٹیا، ہم سے جو ہو رہا ہے تمہارے بیاہ کے لئے کر رہے ہیں۔ اپنی طرف سے تو اچھا ہی چاہتے ہیں، لیکن اللہ کی مرضی۔ تمہارے لائق رشتہ نہیں مل رہا ہے۔'' ان کی آواز مدھم تھی۔

قمر ایک دم سے آنسو پونچھ کر بدک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کیا اماں سوچ رہی ہیں کہ اسے اپنی شادی کی جلدی پڑی ہے؟ وہ لاکھ منہ پھٹ سہی، ایسا کیسے کہہ سکتی تھی، پھر یہ کہ وہ ایسا سوچتی بھی نہیں تھی۔ نہ اس کی ایسی عمر آئی تھی، نہ ایسی بے شرمی طاری ہوئی تھی، یہ اور بات تھی کہ جتنی بے شرمی وہ برت لیا کرتی تھی وہ اماں کے حساب سے بہت زیادہ تھی، اس لئے اکثر معنی مطلب پہنا لیتی تھیں۔ قمر تلملا کے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک پگلی آن کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ کام ختم کر کے اس نے آنگن میں لگے نلکے پر رگڑ رگڑ کر ہاتھ کہنیوں تک دھو لئے تھے۔ دوپٹے میں ہاتھ پونچھتی ہوئی بولی کہ آج وہ بہو سے لڑ کر بغیر کھائے پیے

PDF Compressor Free Version

نکل کھڑی ہوئی تھی، اس لئے اماں اسے فوری طور پر کچھ کھانے کو دے دیں، ورنہ اگلی جمائی میں جاتے جاتے وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ دراصل بگی کا ناشتہ کھانا کچھ بندھا ہوا نہیں تھا۔ بس مہینے میں دو، کہیں چار روپے تنخواہ کے ملتے تھے۔ کبھی کچھ بچا کھچا ہوا یا از خود مانگ بیٹھی تو مل جایا کرتا تھا۔ جاڑوں میں کسی کسی گھر میں الگ رکھے ٹوٹے ہوئے مگ یا تام چینی کے چینی جھڑے پیالے میں کبھی کبھار چائے مل جاتی تھی۔

''ہا، دکھیا!''

اماں آنگن پار کر کے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

بگی جا کے تنکے کے پاس بیٹھ گئی اور اطمینان سے آم کے اچار کے ساتھ رات کی باسی روٹیاں ہبڑ ہبڑ کھاتے ہوئے، پھولتی سانسوں کے درمیان اچار جیسی چٹ پٹی خبر بھی سنائی۔

''حاکم کی سب سے چھٹکی بٹیا الٰہ آباد ماں پڑھت رہی نا۔ سردارن کا بٹوا بھی وہیں چلا گوا ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ سب لڑکے لڑکیاں پڑھنے کو بڑے شہروں میں نکل رہے ہیں۔ ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے کہ بے پڑھے لڑکیوں کا بھی گزر نہیں۔''

اماں ایسی باتوں میں دلچسپی کم لیتی تھیں جن کی صداقت مشکوک ہو اور جن سے خواہ مخواہ کسی پر حرف آئے۔ ''اپنے کام سے کام رکھا کر، بگیا۔''

اپنے کام سے کام رکھنے کو بگی نے نظر انداز کر دیا۔

''کا ہوا؟'' بگی کے گلے میں چاندی کی خلال پڑی رہتی تھی اور ناک میں چاندی کا بڑا سا پھول۔ اس نے خلال سے دانت کریدے اور ناک کا پھول گھمایا:

''ارے ہوئیں نام لکھایا ہے جہاں حاکم کی بٹیا پڑھت ہے۔ کچھ سمجھا کرو دیدی!''

اماں گھبرا گئیں۔ بگی جنہیں حاکم کہتی تھی وہ مسلمان تھے اور لڑکا سردار۔ ملک کے بٹوارے کو ابھی پندرہ سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ جنہوں نے براہ راست کچھ نہیں جھیلا تھا انہیں بھی اس کا بہت کچھ علم تھا اور پھر ایسا کون سا گھر تھا جس کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے اور بھی بہت کچھ دکھائی دیتا رہتا تھا۔ مثلاً پرتاپ گڑھ میں ریلوے ڈپو کے پاس کنکریٹ کے بہت سے چھوٹے چھوٹے چوکور بکسے جیسے لگنے والے کوارٹروں کی ایک پوری کالونی اُگ آئی تھی۔ اس میں جو لوگ رہنے آئے وہ مقامی لوگوں سے الگ تھے۔ ان کا رہن سہن، ان کی زبان، ان کی عورتیں، ان کے گھر کی تہذیب، سب مختلف تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان کے گھر کے مرد اردو اخبار خریدتے تھے۔ لوگ انہیں ''شرنارتھی'' کہتے تھے، لیکن دس سال ہوتے ہوتے وہ عام آبادی میں گھل مل گئے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے انہیں شرنارتھی کہنا بھی بند کر دیا، ''پنجابی'' کہلاتے یا ''سردار''۔ بڑے محنتی لوگ تھے۔ زیادہ تر نے چھوٹے موٹے کاروبار کیے۔ ایک صاحب تھرمس میں رکھ کر گھر کی بنی ہوئی قلفی لوگوں کے یہاں پہنچانے لگے تھے۔ کوئی پانچ سات برس بعد انہوں نے برف بنانے کی فیکٹری کھول لی۔ فرج لوگ ابھی بالکل نہیں جانتے تھے۔ گرمی میں برف کی بڑی بڑی سلیں برادے کی موٹی تہہ سے ڈھک دی جاتی تھیں، پھر اوپر سے موٹا ٹاٹ ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ سلیں جگہ جگہ دکانوں پر رکھی ہوتیں۔ وہاں سے گاہک تلوا کر برف لے جاتے۔ کچھ لوگ اپنے تھرمس لے کر آتے تھے۔ ان میں چھوٹے ٹکڑے کرا کے بھر کے پہنچاتے۔ یہ برف قریب کے بڑے شہروں سے آتا تھا اور لانے میں کافی ضائع ہوتا تھا۔ شہر میں کارخانہ کھلا تو لوگوں کو بڑی آسانی ہو گئی۔ وہاں آئس کریم بھی جمائی جانے لگی۔ پہلے سردار جی گھر پر گھما گھما کر چلائی جانے والی چھوٹی مشینوں میں قلفی جماتے تھے۔ جن لوگوں نے ذرا ذرا سے کھوکھوں میں کپڑے اور بساط خانے کی دکانیں کھولی تھیں، ان کی اب بڑی بڑی شیشوں سے مزین دکانیں ہو گئی تھیں۔ لڑکے بالے پڑھنے جاتے تھے۔ عورتیں گھر میں ایک نوکر نہ رکھتیں؛ سارا کام خود کرتی تھیں۔ مقامی لوگوں کے یہاں تو معمولی متوسط طبقے میں بھی کل وقتی نہیں تو جز وقتی نوکرانیاں ضرور کام کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے یہاں بوائیں اور ہندو گھروں میں کہاریاں۔

''بڑے جیالے لوگ ہیں'' ایک بار ابا نے کہا تھا:

''لٹ پٹ کے آئے، لیکن دیکھو، شہر پہ چھا گئے۔ کیا مجال جو کبھی کسی نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ ان کے یہاں کا کوئی

PDF Compressor Free Version

شخص بھیک مانگتا نظر نہیں آیا۔ کاروبار کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ مقامی زبان و مقامی لب و لہجے میں بولنے لگے ہیں۔ مقامی آبادی میں پوری طرح گھل مل گئے۔"

انہی جیالے، گھل مل جانے والے لوگوں کے یہاں کا ایک گورا، اونچا پورا، نہایت وجیہ لڑکا ایس۔ ڈی۔ ایم صاحب کے یہاں آنے جانے لگا تھا۔ افسروں کے یہاں حواری مواریوں کی جو بھیڑ رہتی ہے اسی میں وہ بھی کھپا رہتا۔ آخری پوسٹنگ میں ڈپٹی صاحب کو وطن مل گیا تھا، اس لئے ریٹائر ہو کر بھی وہ یہیں رہ پڑے تھے۔ ریٹائر ہوئے تو کچھ ہی عرصے میں خوشامد خوروں کی بھیڑ چھٹ گئی، لیکن وہ لڑکا بنا رہا۔ جب دیکھو تب موجود۔ آنٹی آنٹی کر کے ڈپٹیائن کے پیچھے آگے لگا رہتا۔ گھر کا سودا سلف تک لا دیتا۔

اماں نے گھبرا کر قمر کو دیکھا اور پھر پگلی کی طرف۔

"اچھا چپ رہا کر، بہت بکتی ہے۔"

قمر کی آنکھیں کاغذوں پر تھیں۔ آنسو پونچھ کر وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر اپنے نوٹس درست کرنے لگی تھی۔ چہرے سے ایسا نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے پگلی کی کوئی بات سنی ہے۔ اماں نے اطمینان کی سانس لی اور رمضانی بوا کو ترکاری لانے کے لئے پیسے نکال کر دینے لگیں، گویا پگلی کو بات بالکل ختم ہو جانے کا سگنل دے دیا۔

قمر نے نوٹس پر سے نظریں اوپر اٹھائیں اور جھانجھر بجاتی، پیٹھ پھیر کر باہر نکلتی پگلی کو گھور کر دیکھا۔ نظریں اگر برما ہوتیں تو پیٹھ میں چھید ہو گئے ہوتے۔

"ان لوگوں نے اماں کا دماغ اور خراب کر رکھا ہے۔ ہول گئی ہوں گی۔ الٰہ آباد میں تو میں بھی پڑھتی ہوں۔ کہیں میرے پیچھے تو آ کے کسی لونڈے نے وہاں نام نہیں لکھوالیا، میرے ہی ڈپارٹمنٹ میں بی۔ ایڈ کرنے کے لئے۔"

"ایسی باتیں لڑکیوں بالیوں کے کان میں نہیں پڑنی چاہئیں۔"

رمضانی بوا نے باورچی خانے کی کھونٹی سے ٹنگا اور دھواں کھا کے ملگجا ہوا ترکاری لانے کا تھیلا اتارتے ہوئے کہا۔

"اب تم چپ رہو بوا!" اماں پھپھسائیں۔

"جو نہ سنا ہو تو اب تم سے سن لے۔ کل وہ چلی آئی تھیں سڑن، امیرن آپا، ایسی ہی کچھ ہی کچھ اول فول سناتی ہوئی۔ اللہ سے توبہ ہے۔ کیا زمانہ آن لگا ہے؟"

انہوں نے غصے میں چولہے کی جلتی آگ میں بلا وجہ پھکنی اٹھا کر پھونک ماری، پھر زور سے بولیں، جیسے قمر کو سنا رہی ہوں کہ یہاں سبزی ترکاری آٹے دال کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہو رہی ہے۔

"آدھا سیر مٹر ضرور لے لینا بوا۔ سنا ہے مٹر آ گئی ہے بازار میں اور سیر بھر نئے آلو تلوا لینا۔ اللہ مارے پرانے بڑے میٹھے ہو چلے ہیں۔ ترکاری کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

قمر زیر لب مسکرائی۔ اماں، تم ڈال ڈال تو ہم پات پات۔ ہمیں تو یہ بھی پتا ہے کہ امیرن خالہ کیا پھپھسا گئی ہیں۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس لوٹتے تو الٰہ آباد یونیورسٹی کے کئی لڑکے لڑکیاں اکثر بس میں ساتھ سفر کرتے دکھائی دیتے۔ یہ معمول تھا، اتفاق نہیں۔ کئی لڑکیاں گھر سے برقع اوڑھ کر نکلتیں اور بس میں اتار دیتیں۔ گھر والے یہ بات جانتے تھے۔ 'حاکم' کی بیٹی آمنہ سے تو قمر کی کئی بار بس میں ہی ملاقات نہیں ہوئی بلکہ یونیورسٹی میں بھی آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ آج بھی وہ بس میں تھی۔ کئی اور لڑکے بھی تھے۔ جگجیت بھی تھا جو بالکل پیچھے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ آمنہ اور قمر برابر کی سیٹوں پر تھیں۔

"ہمارے تمہارے درمیان الٰہ آباد کے علاوہ ایک اور لنک (Link) بھی ہے۔"

قمر نے مسکرا کر آمنہ سے کہا۔ آمنہ بے حد کم سخن تھی۔ جواب میں اس نے صرف بڑی بڑی اداس آنکھیں اٹھا کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"پگلی مہترانی!"

قمر نے آمنہ کی خاموش نگاہوں کے سوال کا جواب کچھ یوں دیا کہ وہ کم سخن لڑکی بھی بے اختیار ہنس پڑی۔ پگلی آمنہ کے یہاں بھی کام کرتی تھی، مگر شناساؤں کے درمیان اس کا ذکر کبھی یوں نہیں آیا تھا۔

"ہنس لو" قمر نے پھر کہا:

"وہ اماں سے کہہ رہی تھی کہ حاکم کی بٹیا جہاں پڑھتی ہے وہاں سرداروں کے لونڈوں نے بھی نام لکھوایا ہے۔"

PDF Compressor Free Version

ایک اضطرابی کیفیت کے تحت آمنہ کا سر پل بھر کو پیچھے گھوما۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر قمر سے خاموش رہنے کی گزارش کی۔ اس کی اچانک آجانے والی ہنسی یوں غائب ہوگئی تھی جیسے سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ گھاس پر پڑی اوس کی بوندیں۔

''پگلی کو ابھی یہ پتا نہیں چلا ہے کہ میری شادی تقریباً طے ہو چکی ہے، ورنہ یہ بھی الم نشرح ہو جاتا۔''

کچھ دیر کے بعد آمنہ نے رسان سے کہا، اس کے بعد پورا سفر خاموشی سے گزار دیا۔

فروری کے مہینے میں ریٹائرڈ حاکم کے یہاں سے ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا۔ یہ کارڈ دراصل آمنہ نے قمر سے یاد اللہ کی وجہ سے بھجوایا تھا۔ قمر کے امتحان مارچ میں ہونے والے تھے، اس لئے وہ گھر نہیں آسکی تھی۔ اب ڈپٹی صاحب کے گھر کا بلاوا تھا، اس لئے اماں گئیں۔ نہ جانے کیوں انہوں نے راحت کی سانس لی تھی۔ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ! انکھیوں سے انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اونچا پورا، گورا چٹا، خوبصورت سردار لڑکا سارے انتظامات میں پیش پیش ہے اور گھر کے اندر بھی بلا تکلف آجا رہا ہے۔

''سنتے ہیں، بٹیا کی ڈولی اٹھی تھی تو بہت رویا۔'' سارے فسانے میں جس بات کا ذکر نہیں تھا، یقیناً پگلی نے اپنی طرف سے جوڑی ہوگی، اماں نے سوچا، لیکن شہر کے کئی گھرانوں، خصوصاً سول لائنز کی آبادی میں یہ بات چرچا کا موضوع بنی کہ آمنہ کی ڈولی اٹھی تو جگجیت سنگھ بہت رویا تھا۔

''عورتوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ کون تھا وہ لڑکا؟'' ایک خاتون نے رخصتی کے فوراً بعد پوچھا تھا۔

آمنہ کی والدہ نے کہا: ''بہت زمانے سے آتا تھا، بہن کی طرح مانتا تھا منّا کو۔''

مقامی ڈاکٹر رام چرن داس کھتری کی دو بیٹیاں بھی الٰہ آباد یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھیں۔ ایک تو آمنہ کی کلاس فیلو بھی تھی۔ ڈپٹیائن نے جب یہ بہن کی طرح ماننے والی بات کہی تو دونوں وہیں موجود تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرائیں۔

سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کے سامنے بڑا سا لان تھا۔ اس میں پتھر کے اسٹول بنے ہوئے تھے۔ وہاں وہ دونوں اکثر چپ چاپ بیٹھے دکھائی دیتے۔ ان کے چہروں پر ایسی معصومیت، ایسی اداسی، ایسی خاموشی بکھری ہوتی تھی کہ کسی نے مذاق نہیں اڑایا، کبھی ایک بھی نازیبا جملہ نہیں کسا۔ بس ایک مرتبہ ایک لڑکی نے، جو خود جگجیت پر فدا تھی، بڑی حسرت سے کہا تھا:

''آمنہ، یہ جگجیت بڑا خیال رکھتا ہے تمہارا!''

خفیف سی دھار رقابت کی بھی تھی۔ ''تمہارے لئے گھر کا کھانا لے کے آتا رہتا ہے۔''

''ہاں، ماں بھیجتی رہتی ہیں۔''

آمنہ نے ستھری نظریں اٹھا کر سادگی کے ساتھ سادہ سا جواب دیا۔ کس کی ماں، یہ وضاحت اس نے نہیں کی۔ جگجیت ہمیشہ سے آمنہ کے بنگلے پر آتا رہتا تھا۔ الٰہ آباد اور پرتاپ گڑھ میں فاصلہ اتنا کم تھا کہ اکثر وہ سنیچر کی شام کو گھر بھاگ آتا اور پیر کو علی الصباح واپس لوٹ کر کلاسز کر لیتا۔ لوٹتا تو ڈبوں میں بھر واں پراٹھے، کوئی سوکھی سبزی اور آم کا اچار لے کر آتا۔ اس کی ماں بڑے عمدہ پراٹھے بناتی تھی۔

''گرم اور زیادہ مزیدار ہوتے ہیں منا!'' وہ ہر بار کہتا۔

''لیکن میری ماں پراٹھے اتار رہی ہو اور تم پاس بیٹھ کر کھا رہی ہو، یہ سپنا تو سپنا ہی رہ جائے گا۔'' اور آمنہ کی آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو جاتی۔

یہ اور ایسے بہت سے سپنے دل میں لیے آمنہ، فرسٹ کلاس ایم۔اے سوشیالوجی، ریٹائرڈ پی۔سی۔ایس افسر کی بیٹی، خاموشی سے کسی اور کی ماں کو پراٹھے تل کر کھلانے کے لئے وداع ہوگئی۔

ایسے قصے خال خال سہی، لیکن سننے میں آرہے تھے۔ سنانے والوں کے لہجے میں معنی کی دنیا پنہاں ہوتی۔ کوئی سمجھتا، کوئی ٹال جاتا، لیکن قمر کی اماں بیٹی کے الٰہ آباد جانے کے بعد سے ہر وقت خوفزدہ رہا کرتی تھیں۔ امیر ن خالہ بتا رہی تھیں کہ پرلے محلے کے ایک باعزت کایستھ گھرانے کی بیٹی اپنے سگے چچازاد کے ساتھ بھاگ گئی اور شادی رچا کے واپس لوٹی۔ اب بھلے ہی دکن کے کچھ ہندو سگے ماموں بھانجی کی

PDF Compressor Free Version

شادی کو افضل قرار دیں، لیکن شمالی ہندوستان کا کوئی ہندو کسی بھی 'زاد' سے شادی کو قبول نہیں کرتا۔

''ہمارے یہاں یہ شادیاں جائز ہیں، اسی لئے ہمارے وقت میں ماموں زاد، خالہ زاد وغیرہ سے بھی زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیتے تھے۔ سامنے تو خیر جاتے تھے، تھوڑا بہت ہنس بول بھی لیتے تھے، لیکن ماں، نانی، دادی، خالہ، پھوپھی کی چیل جیسی نظروں تلے۔ اب دیکھو تو لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہیں۔ قمر کہہ رہی تھی کہ بس میں آرہی تھی تو ساتھ کے دو لڑکے بھی تھے۔ راستے بھر ہنستے بولتے چلے آئے۔ بڑے اطمینان سے کہہ گئی، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے باپ کی مت ماری گئی تھی جو پہلے بی۔اے اور پھر بی۔ایڈ کے لئے بھی باہر بھیج دیا۔ پرتاپ گڑھ میں تو مجال نہیں کہ بغیر برقعے کے نکل جائیں، لیکن ادھر بس میں چڑھیں یا ٹرین میں بیٹھیں اور برقع جھولے میں۔''

لاکھ قمر چڑتی، لیکن اماں اس کے سیاہ رنگ کے بڑے سے اسمارٹ بیگ کو وہ ''جھولا'' ہی کہتیں اور ''بی۔ایڈ'' نہ کہہ کر ''استانیوں والی پڑھائی۔''

رزلٹ آنے سے پہلے سے ہی قمر اخباروں پر جھکی، نوکریوں کے اشتہار دیکھتی رہتی تھی۔ دو انگریزی اخبار لگا لئے تھے۔ ابا تو 'سیاست' منگایا کرتے تھے۔ ماں بولتی کچھ نہیں تھیں، بس گھبراتی رہتی تھیں۔ 'لو جی، اب یہ نوکری بھی کریں گی۔ اب تک تو یہ تھا کہ لڑکی پڑھ رہی ہے، لڑکی پڑھ رہی ہے۔ یا مولا مشکل کشا!''

رزلٹ آیا تو وہ اور شد و مد سے خالی جگہوں کے کالم پر نظریں دوڑانے لگی۔

''ابا،'' ایک دن اس نے خبر سے نظریں اٹھائے بغیر باپ کو مخاطب کیا: ''یہ ملازمت بہت معقول معلوم ہو رہی ہے، لیکن درخواست منگائی ہے باکس نمبر کی معرفت۔ اللہ جانے کہاں ہے اسکول، کس شہر میں ہے۔ درخواست دیں؟''

''درخواست دینے میں حرج نہیں،'' ابا نے جواب دیا۔

''جگہ بھی مناسب ہوئی، یعنی آس پاس، تو ٹھیک، ورنہ چھوڑ دینا، مت جانا۔''

''میں کچھ کہوں تو کانوں تیل ڈال کے بیٹھ جاتے ہیں، نوکری کے لئے جھٹ سے بیٹی کی بات سننے کو تیار۔ لڑکا ڈھونڈنے میں مستعدی دکھائیں تو ہم جانیں!''

اماں منہ ہی منہ میں بدبدائیں۔ ابا کے زیادہ منہ لگنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ تو کچھ ایسا قائل کرتے رہے تھے کہ جیسے بی۔ایڈ کرتے ہی لڑکا آسمان سے اب اترا کہ جب اترا۔ ''سلمان چچا والے رشتے کو منع نہ کیا ہوتا تو بلا سے روٹیاں پکاتی، بیس کہ پچیس کی، آج گود میں ایک دو بچے کھیلتے ہوتے اور اب کون سی روٹیاں پکانے سے فرصت ملے گی! عورت کا جنم — ماشٹری بھی کریں گی اور روٹی بھی ٹھوکیں گی۔ ہم سے زیادہ سخت زندگی گزرے گی۔'' انہوں نے سر دنتا چلایا اور کھٹاک سے ڈلی کے دو ٹکڑے کیے۔

''اماں کل جبھی تمیں کیا؟''

قمر نے اپنے گالوں پر تھپڑ لگائے۔ ''میں کتنی بری بیٹی ہوں! میں یہ بھی تو سوچ سکتی تھی کہ اماں کو الہام ہوا تھا، یا ان کی زبان پر سرسوتی آن بیٹھی تھی۔'' اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پڑوس کے مکان کی کال بیل دبائی۔ دونوں بچیاں اچھلتی ہوئی باہر آئیں۔ پیچھے پیچھے نیک دل، ادھیڑ عمر، تنہا رہنے والی، مہربان پڑوسن جنہیں گویا اللہ میاں نے تعینات کر دیا تھا کہ قمر کی نوکری اور گرہستی دونوں چلتی رہیں۔ ''ہاں بھائی، سنبھالو،'' انہوں نے روز کا جملہ دہرایا اور شفقت سے مسکرا کر دروازہ بند کر لیا۔

بچیوں کا اسکول قمر کے اسکول سے پہلے چھوٹ جایا کرتا تھا، وہ کوئی دو گھنٹے بعد آتی تھی۔ اس دوران بچیاں ان خاتون کے گھر رہتی تھیں جنہیں قمر 'شانتی آنٹی' کہتی تھی اور لڑکیاں 'شانتی نانی'۔

اپنے دروازے کا تالا کھول کر قمر اندر داخل ہوئی۔ دو دن سے بو نہیں آرہی تھی۔ باورچی خانے کا سنک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ قمر نے جلدی سے ایپرن چڑھایا اور کچھ ضروری برتن دھو کر الگ ہٹائے، باقی یونہی رہنے دیے۔ فرج سے گندھا ہوا آٹا اور سبزی نکالی جو وہ سویرے ہی

PDF Compressor Free Version

دھوکا کاٹ کر رکھ گئی تھی۔ جلدی سے ایک طرف سبزی چڑھا کر توا ڈالا اور پراٹھے سینکنے شروع کیے۔ بچیوں نے فرج کھول کر اپنے لئے کولڈ ڈرنک نکال لیا تھا اور میز پر رکھے کیلوں کے گچھے سے کیلے لے لئے تھے۔

''زیادہ کیلے مت کھانا!'' قمر نے پکار کر کہا۔

''کھانے کا وقت ہے۔ بس ابھی لائی، یوں!'' اس نے چٹکی بجائی، پھر اس نے جلدی سے میز پر پراٹھے، سبزی اور دہی کا سادہ سا کھانا لا کر رکھ دیا اور دل میں سوچا کہ آج یہ گیس، پریشر کوکر اور فرج ایک ہاؤس وائف کے لئے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اس نے تولیہ سے ہاتھ پونچھے اور خود بھی پاس بیٹھ گئی۔

''پھر وہی لوکی'' بڑی بچی منمنائی۔

''چپ چاپ کھالو۔ دیکھ نہیں رہی ہو، ممی کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔''

قمر نے حیرت سے دیکھا۔ چھوٹی کو چھ سال پورے ہونے میں ابھی دو تین مہینے باقی ہی تھے۔ اتنی سمجھ اور ماں کے لئے ایسی ہمدردی؟ قمر کا جی بھر آیا۔ ویسے بڑی صرف گیارہ مہینے بڑی تھی۔ دونوں آگے پیچھے اتنی جلدی ہو گئی تھیں کہ جڑواں جیسی لگتی تھیں۔ پراٹھے کا نوالہ لے کر بڑی لڑکی نے اپنی نکتہ چینی کی تلافی کی:

''کوئی بات نہیں ممی، دہی بھی تو ہے۔ ہم دہی شکر کے ساتھ بھی کھالیں گے۔'' قمر نے شکردان اس کے سامنے سرکا دیا جو وہیں میز پر رکھا تھا، پھر دونوں کی پلیٹ میں کھانا نکال کر اٹھ گئی۔

''ممی، تم؟''

''میں پہلے کچن صاف کرلوں، پھر نہا کر اطمینان سے کھاؤں گی۔'' صفائی کے کوئی گھنٹہ بھر بعد وہ غسل خانے میں داخل ہوئی۔ نہا کر ساری کی جگہ شلوار قمیص پہنی۔ اس نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا تو نیند سے آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ گرمیوں کی سہ پہر تھی۔ ایک گھنٹہ ہلکی جھپکی، پھر اٹھ کر بچیوں کا ہوم ورک کرانا، شام کی چائے کے لئے کچھ تیار کرنا۔ چھ بجے انیس آجائے گا، اس کے حوالے بچیوں کو کر کے وہ بازار جائے گی۔ رات کے کھانے میں کچھ اچھا پکنا چاہیے۔ دال، چاول، ایک سبزی گوشت یا مرغ کا سالن، روٹیاں۔ کبھی کبھی گوشت پکانے کی جگہ وہ کباب لے آتی تھی۔ انیس شاذ و نادر ہی خریداری کے لئے نکلتا، لیکن کھانے میں کمی ہو تو ٹوک ضرور دیتا تھا۔ ''ایک وقت ہی تو چین سے پورا کھانا کھانے کو ملتا ہے، ورنہ آفس میں تو وہی سوکھی روٹی، سوکھی سبزی۔''

''کبھی تم بھی کچھ لے آیا کرو'' قمر نے ایک آدھ بار طعنہ دیا تو اس نے ٹکا سا جواب ٹکا دیا'' یہ تمہارا ڈپارٹمنٹ ہے۔'' بس کبھی کبھی بیوی اور دونوں بچیوں کو اسکوٹر پر بیٹھا کر حضرت گنج لے جا کر آئس کریم کھلاتا تھا یا کچھ پھل خرید لیتا۔

''آں.....'' بڑی لڑکی قمر کی پلیٹ میں جھانکنے لگی تھی۔

''ہم کو لوکی کھلا کر تم کیا کھا رہی ہو؟.....'' اس نے متجسس نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''من وسلویٰ.....کھاؤ گی؟'' قمر نے ہنس کر کہا: ''بیوقوف، فرج میں پرسوں سے دال پڑی تھی، میں نے سوچا کھا کے ختم کروں۔ تمہارے پاپا تو فرج میں رکھی دال کھاتے نہیں اور تمہیں ہری سبزی کھانی چاہئے، اس لئے لوکی بنا دی۔'' لڑکی اتنا طویل لکچر سننے سے پہلے سانپ سیڑھی کے لوڈو پر جھک گئی تھی۔ دال اسے یوں بھی سخت ناپسند تھی۔ اس سے اچھی تو لوکی کی سبزی تھی۔

میں بالکل اماں جیسی ہوتی جا رہی ہوں، قمر نے ہول کر سوچا: کہیں لڑکیوں کے ساتھ اتنی ہی سخت گیر بھی نہ ہو جاؤں۔

''ادھر آؤ'' اس نے دونوں کو پکارا۔ وہ فوراً پاس آگئیں۔ قمر نے پلیٹ ہاتھ سے رکھ دی، انہیں گود میں بیٹھا لیا، پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور دل ہی دل میں بولی:

''میرے اور تمہارے بیچ اتنا جنریشن گیپ نہیں ہوگا جتنا میرے اور اماں کے بیچ تھا، بھلے ان کی طرح باسی کھانا سوارت لگاتی پھروں۔''

''لوڈو پھر کھیل لینا، کچھ دیر چلو چل کر سوتے ہیں، پھر ہوم ورک اور تب کھیل۔'' اس نے پیار سے دونوں کو گود سے ہٹا دیا۔ چھوٹی اس سال اپر کے جی ختم کر کے اسٹینڈرڈ ون میں آنے والی تھی اور بڑی آچکی تھی۔ دونوں کو ہوم ورک ملتا تھا۔ انیس تو صفا ہاتھ جھاڑ لیتا:

''تم ٹرینڈ ٹیچر ہو، اسکول میں پڑھاتی ہو، میں نو بجے سے چھ بجے تک آفس کرتا ہوں۔ میرے دماغ میں یوں بھی طاقت نہیں رہ

PDF Compressor Free Version

جاتی۔'' انیس اس بات پر بہت زور دیتا رہتا تھا کہ وہ نو سے چھ تک آفس کرتا ہے جب کہ قمر دو ڈھائی بجے گھر آجاتی ہے اور پھر اسے چھٹیاں بھی بہت ملتی ہیں۔ جب دیکھو تب کسی نہ کسی وجہ سے اسکول بند۔

''ارے تمہارا کیا ہے، عیش ہیں تمہارے تو، عیش۔ دو مہینے پورے! ہمیں نہ مل جائیں گرمی کی چھٹیاں۔ ارے دس بیس روز کی بھی مل جائیں۔'' گرمی کی چھٹیوں بھر وہ طوطے کی طرح دہراتا رہتا تھا۔

بظاہر یہ سچ بھی تھا، لیکن انیس نے یہ سوچنے کی زحمت شاید کبھی نہیں کی تھی کہ ایک بار گھر واپس آجانے کے بعد اسے کچھ نہیں کرنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار تو اسے بھی چھٹی ملتی تھی، پھر اتوار تو تھا ہی۔ اس میں وہ سوتا تھا یا دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس جا بیٹھتا۔ گھر پر مزے سے ٹی وی دیکھتا، چائے کے ان گنت کپ پیتا جو ظاہر ہے قمر ہی بناتی تھی۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا کہ وہ قمر کو تنگ کرنے کے لئے اتنی چائے پی رہا ہے۔ قمر نے ایک بہت مہنگی کمپنی کا ہیلتھ ڈرنک خریدا تھا۔ وہ رات میں بچیوں کو دیتی تھی اور اسی وقت ایک کپ بنا کر انیس کو بھی۔ خود اس نے کبھی نہیں لیا۔ گھر دو تنخواہیں آرہی تھیں، لیکن پھر خرچ بھی تو ویسے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو بچیوں کا انگریزی اسکول۔ اگر وہ بھی ملازمت نہ کر رہی ہوتی تو بچیاں اس مہنگے اسکول میں کبھی نہیں جا سکتی تھیں۔ انیس چاہتا تھا کہ ان کے یہاں ایک بچہ اور ہو۔ شاید اس بار لڑکا ہو جائے۔

''میں اپنے بیٹے کے ساتھ فٹ بال کھیلوں گا اور کرکٹ''

وہ بڑے ارمان سے کہتا تھا اور اسے اپنی ماں اور قمر کی ماں، دونوں بوڑھیوں کی حمایت حاصل تھی، لیکن قمر ابھی تک اڑی ہوئی تھی۔

''تم سب نے مل کر گارنٹی لی ہے کیا کہ اس بار بیٹا ہی ہوگا؟'' ایک بار اس نے اپنی فطری کٹھ حجتی کے ساتھ چڑ کر کہا تھا۔

''اماں کو ایک بیٹی کے بیاہ میں دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ میرے پاس دو ہیں۔ تیسری بھی بیٹی ہوگئی تو کہاں ٹھکانے لگاؤں گی؟'' لیکن یہ کہتے ہوئے قمر کو شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اماں تو اماں، اس میں پگلی جمادارن کی روح کا بھی کچھ حصہ حلول کر چکا ہے۔

اس دن قمر کا ہائی اسکول کا رزلٹ آیا تھا، اس لئے وہ صبح اسے اچھی طرح یاد تھی۔ فرسٹ ڈویژن کا نشہ اچھی طرح یاد تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے لئے باہر نہ جا سکنے، بوائز اسکول میں نام لکھوا کر سائنس نہ پڑھ سکنے کی شدید مایوسی اچھی طرح یاد تھی اور یاد تھی پگلی جمادارن، جو آنگن میں جھاڑو لگاتے لگاتے یکا یک رک کر جھاڑو کے لانبے ڈنڈے پر ٹھڈی ٹکا کر کھڑی ہوگئی تھی اور انتہائی تاسف کے ساتھ ایک ہاتھ کی انگلی ناک پر رکھ کر بولی تھی:

''ہائے رے دیا، پھن بٹیا!'' (یا مالک، پھر بیٹی ہوگئی!)

ہاتھ میں اخبار لہراتے ابا اور برقع پھڑکاتی امیرن خالہ ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ امیرن خالہ تو سلام تک کرنا بھول گئیں۔ ''صبح صبح بٹیا ہوئی ہے شکلائن کے یہاں۔'' انہوں نے پھولتی سانسوں کے درمیان بتایا۔ ان کے ساتھ ہی ابا نے تقریباً نعرہ لگایا:

''لو بٹیا، آگیا فرسٹ کلاس! کتنا ڈری ہوئی تھیں تم۔''

قمر دوڑ کر ابا سے لپٹ گئی۔ انہوں نے ہولے سے سر پر ہاتھ رکھا اور الگ کو ہٹ گئے۔ بچوں کو لپٹا چمٹا کر پیار کرنا اس وقت کے بڑوں کا شیوہ نہ تھا۔ سچ پوچھا جائے تو براہ راست پیار کا کسی بھی طرح کا اظہار نہیں تھا۔

''چلو جاؤ، نفل نماز ادا کرو، قمر'' اماں نے اتنا ہی کہا اور امیرن خالہ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ شکلائن سے ان کی بڑی پٹتی تھی۔

''اے ہے، تیسری بھی بیٹی ہی ہوگئی، کہاں نمٹائیں گے؟ ان لوگوں کے یہاں تو تلک میں بھاری بھاری رقمیں بھی خرچ ہوتی ہیں۔''

''ہئی ہے!'' امیرن خالہ نے برقع اتار کر تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''شکلا جی کی اماں کہتی تھیں، اس بار بھی بیٹی ہوئی تو انہیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ دراصل یہ تیسری نہیں، چوتھی بیٹی ہے۔ پہلی دو چار دن کی ہو کے سوری میں ہی ختم ہوگئی تھی۔''

''اماں، ہمارا فرسٹ ڈویژن آیا ہے۔'' قمر نے زچ ہو کر زور سے پکار کر کہا۔

''جاہل عورتیں! وہ پہلے شکلا جی کی بیوی کا ماتم تو کر لیں'' بڑبڑاتے ہوئے ابا باہر چلے گئے۔

امیرن خالہ رشتے میں اماں کی بہن لگتی تھیں۔ عمر میں چھوٹی تھیں اس لئے سالی ہونے کے ناتے ابا کے منھ لگ کر بول لیا کرتی تھیں۔

PDF Compressor Free Version

ویسے بھی وہ ہڑبڑ ہڑبڑ بولنے کے لئے مشہور تھیں۔ تنک کے بولیں:

''ہاں بھائی صاحب، کہہ لیجئے، ہم تو واقعی جاہل ٹھہرے، لیکن قمر سے پہلے ہماری آپا نے دو بیٹے نہ جنے ہوتے تو ہم آپ سے پوچھ لیتے کہ آپ کتنے عالم فاضل ہیں اور بیٹے بھی کیسے کہ لائق — علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں۔'' پھر آواز قدرے نیچی کر کے بولیں:

''ایک ہی لڑکی ہے اس لئے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔ ارے زیادہ چھانٹے مت، کہیں خدانخواستہ کر کرانہ کھائیں۔''

ابا ان کی زد سے باہر نکل گئے تھے، لیکن اماں تو سب سن رہی تھیں۔ بات بدلنے کو انہوں نے بٹوے سے دو روپے نکال کر پگلی کو مٹھائی کھانے کے لئے دیے۔

''چلو، بٹیا کے پاس ہوئے کی مٹھائی تو کھائے کو ملی۔ سوچا تھا اب کی شکلائن سے چاندی کی جھانجھریں گے۔'' پھر اماں کا دیا ہوا ڈلی چونا ہاتھ کے پیالے میں لیتی ہوئی بولی:

''ٹھیک کہت ہیں بڑی سکلائن۔ شکلا جی کو چاہئے کہ ڈوسر بیاہ کر لیں۔ اتنی جمین جائیداد گاؤں میں ہے۔ سب داماد آ کے کھائے جہیں۔ ایک ٹھو، بڑا جروری ہے۔''

وہ اپنی گلٹ کی جھانجھریں بجاتی چل دی۔

''اس کا نام یونہی پگلی تھوڑی پڑ گیا۔ پاگل تو ہئی ہے، خبطی کہیں کی!'' قمر نے غصے سے کہا۔

''گھر کے پرانے لگے ہوئے نوکروں سے اس طرح بات نہیں کرتے!'' اماں نے جھڑکا۔ ''خواہ وہ جمادار ن ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا ہے جو سنا نہیں۔''

''سن لیتی تو کیا کرتی؟''

''کچھ نہیں کرتی۔ اسے تکلیف ہوتی تو تمہیں گناہ ہوتا۔ پلٹ کے جواب دیتی تو تمہاری بے عزتی ہوتی۔''

''اماں، تمہارے نزدیک ہم پگلی سے بھی گئے گزرے ہیں؟'' قمر نے پیر پٹخے۔ ''مہترانی تمہیں زیادہ عزیز ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے آج کل کے بچوں کو؟'' اماں نے تاسف سے سوچا۔ ''یہ لڑکی کہاں کھپے گی۔ اس قدر بدزبان!''

قمر کی 'کھپتے کھپتے'' عمر شریف اٹھائیس برس ہو رہی تھی اور اماں کو برے برے خواب آنے لگے تھے۔ بڑی خوش فہمی تھی اماں کو — پڑھائی ختم ہوتے ہی شادی کر دیں گی، لڑکا اب حاضر ہوا کہ تب۔ لڑکا فوری طور پر حاضر نہیں ہوا تو نوکری تو ہو جاتی۔ لڑکوں میں سے ایک نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ چونکہ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا، اس لئے وہیں اپنے ہی ڈپارٹمنٹ میں جگہ مل گئی۔ دوسرے نے ایم۔ کام کیا تھا، وہ ایل آئی سی میں نوکری پا گیا۔ انٹرویو کے لئے بمبئی بلایا گیا تھا، آرام سے چلا گیا۔ ناسک میں پوسٹنگ ہو گئی، آرام سے رہ پڑا۔ قمر نے باکس آفس کی معرفت جہاں درخواست بھیجی تھی، وہ ایک دور افتادہ شہر تھا۔ اسکول میں بورڈنگ نہیں تھا۔ سلیکشن ہو جانے کے باوجود قمر نہیں جا سکی۔ پرنسپل نے کہا بھی کہ وہ ایک شریف گھرانے کو جانتے ہیں، وہاں بطور پیئنگ گیسٹ رکھوا دیں گے، لیکن ابا اماں دونوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ لڑکی پڑھ رہی ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں، لیکن نوکری کرنے کے لئے اکیلی لڑکی نہ جانے کہاں، کس کے یہاں رہتی پھر رہی ہے، یہ کوئی سمجھنے کو تیار نہیں ہوگا۔ ایک بار سرکاری ملازمت ملی۔ اس میں تو اور بھی کوردہ دیہات میں بھیج دیا گیا۔ قمر نے خود انکار کر دیا۔ وہاں جا کر اسکول دیکھنے کے بعد اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

''ابا، ہم آفس کی نوکریوں کے لئے درخواست دیں؟''

ایک دن قمر نے پوچھا:

''آخر ہم گریجویٹ تو ہیں ہی۔'' ابا نے اسے صرف گھور کر دیکھا، کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خشمگیں نظریں بذات خود جواب تھیں۔

ملا کی دوڑ مسجد۔ قمر کو آخر اس کے اپنے چھوٹے سے شہر نے ہی پناہ دی۔ وہاں کے ایک پرائیوٹ اسکول میں وہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر پرائمری درجات کی ٹیچر مقرر ہوئی۔ اماں اس کے ہاتھ پر پچیس روپے رکھ کر باقی بڑی پابندی سے جمع کر دیا کرتی تھیں اور خوش تھیں کہ لڑکی گھر پر ہی ہے۔ کہیں باہر نوکری کے نام سے ان کی جان نکلا کرتی تھی، لیکن قمر نے ہار نہیں مانی تھی۔ آس پاس مناسب جگہ مل گئی تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ وہ لکھنؤ، الٰہ آباد، بنارس سے کوئی جگہ نکلی دیکھتی جو اس کی تعلیم کے مطابق ہوتی، تو پٹ سے درخواست بھیج دیتی، تب اماں کی

PDF Compressor Free Version

وادیلا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک دن اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا: ''اماں، بھول جاؤ کہ کوئی آسمان سے اترنے والا ہے، اس لئے نوکری تو ایسی کرنے دو جو کسی معقول اسکول میں معقول تنخواہ کے ساتھ ہو۔ میں یہاں برقع پہن کے زنگ کھاتی رہوں؟ ڈیڑھ سو پا کر تین سو پر دستخط کروں؟''

ایک دن قمر نے اعلان کیا: ''کل ہم لکھنؤ جا رہے ہیں۔ ہمارا انٹرویو لیٹر آیا ہے۔ عرشی خالہ کے یہاں ٹھہر جائیں گے۔ اسکول بہت اچھا ہے۔ شاید قسمت ساتھ دے جائے۔'' اماں اب تک قسمت پر شاکر ہونے لگی تھیں، زیادہ وادیلا نہیں مچائی۔ لکھنؤ پر تو ابا بھی کچھ نہیں بولتے تھے، وہاں کئی رشتے دار موجود تھے۔

تب ہی وہ انہونی ہوئی۔

حسب دستور کمپارٹمنٹ میں گھستے ہی قمر نے برقع اتار کر جھولے میں ڈالنے کے لئے اس کی زپ کھولی ہی تھی کہ اس کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ لانبے قد کا، سانولا لیکن جاذب نظر نوجوان تھا جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی کے باوجود اس کی آنکھوں میں قمر کی برقع بیگ میں ڈالنے کی حرکت سے نہایت محظوظ ہونے والی کیفیت تھی۔ قمر سٹپٹا گئی۔ وہ نوجوان بھی دوسری طرف کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جھجکتے ہوئے دو چار جملوں کا تبادلہ ہوا۔

ایک چھوٹے اسٹیشن پر اس نے چائے خریدی تو ایک کوزہ قمر کو بھی پیش کر دیا۔ وہ لکھنؤ کے کسی بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ پرتاپ گڑھ اس کی بیوی کا میکہ تھا۔ وہ گویا اپنی سسرال آیا ہوا تھا۔

''تو اہلیہ وہیں رک گئیں؟'' قمر نے چائے قبول کر لی تھی اور بھرتی کا سوال کر رہی تھی۔

''ان کی دوسری برسی تھی۔'' اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

(''کسی کنواری کے نصیب سے بیاہی مرتی ہے،'' ایک بار امیرن خالہ نے کہا تھا تو کٹھ حجت قمر ہنس پڑی تھی۔ ''اگر مرحومہ کا شوہر کسی بیوہ سے شادی کرے تو؟'' اس نے امیرن خالہ کو چھیڑا تھا۔ ''بیوہ سے شادی کون کرے ہے جی؟ کنواری کو جڑتا نہیں، مطلقہ اور بیوہ کو برکہاں سے جڑے گا؟'' پھر انہوں نے کئی قصے سنائے جن میں پچاس پچپن، یہاں تک کہ ساٹھ برس کے رنڈوے پچیس، زیادہ سے زیادہ تیس کی لڑکیاں لے کر آئے تھے۔ سب کے نام پتے انہوں نے گنوا دیے۔ ''جھوٹا جانو تو تصدیق کر لو۔'')

''اوہ، معاف کیجئے گا۔'' قمر گڑبڑا گئی۔

''میں صبح ناشتہ کر کے نہیں چلا تھا۔ مرحومہ کی والدہ نے کچھ پیک کر دیا ہے۔ آپ شیئر کریں گی؟'' اس نے اخبار بچھایا اور ڈبا کھولتے ہوئے قمر سے پوچھا۔ ڈبے میں انڈے اور پراٹھے تھے اور کچھ مٹھائی بھی۔ قمر نے شائستگی سے انکار کر دیا۔ وہ یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھ چکی تھی، بات چیت میں کوئی جھجک نہیں تھی، لیکن اجنبی مردوں سے بے تکلف ہونا اس کا شیوہ نہیں تھا — اس کا ماحول ہی کچھ ایسا رہا تھا، پھر یہ کہ اس وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ناشتہ شیئر کرنے سے تو انکار کر دیا تھا، لیکن وہ مرحومہ کی والدہ کے داماد کو مرحومہ کے ساتھ شیئر کرنے والی تھی۔

باقی سفر لگ بھگ خاموشی سے کٹ گیا۔ لکھنؤ قریب آ رہا تھا تو اس نے بینک کا کارڈ دیا:

''اگر آپ لکھنؤ میں نوکری کریں گی تو اپنا اکاؤنٹ میرے بینک میں کھلوا لیجئے گا۔''

قمر ہنس پڑی۔ ''آپ کے منہ میں گھی شکر۔ نوکری مل گئی تو ضرور کھلواؤں گی۔''

''پرتاپ گڑھ میں آپ کس اسکول میں ہیں؟''

قمر نے جھجکتے ہوئے نام بتا دیا، پھر بولی: ''آپ تو وہاں سب کو جانتے ہوں گے؟''

''میرے سسر تحصیلدار ہیں، ٹرانسفر ہو کر حال میں وہاں آئے ہیں، اس لئے میں مقامی لوگوں کو نہیں جانتا۔''

قمر یکلخت ہنس پڑی۔

''آپ ہنسیں کیوں؟''

اس نے مشکوک انداز میں بھنویں چڑھائیں۔

''ہماری ایک امیرن خالہ ہیں۔ اماں انہیں 'شہر خبر' کہتی ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ کوئی مسلمان تحصیلدار شہر میں وارد ہوئے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

انہی کو کہہ رہی ہوں گی۔ دراصل مسلم افسر کم ہی آتے ہیں نا۔"

"شہر خبرد" پر وہ بھی خفیف سا مسکرا دیا۔

"ایسی خواتین تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہیں۔" لکھنؤ اسٹیشن پر اترتے وقت وہ خاصی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔

قمر کو نوکری یہ بھی نہیں ملی، لیکن وہ نوجوان بار بار ذہن میں آتا رہا۔ چار سال قبل شادی ہوئی تھی۔ دو سال میں بیوی چٹ پٹ ختم ہوگئی۔ رکشے سے اسکول جاتے وقت کئی بار نادانستہ طور پر وہ سوچ بیٹھتی کہ شاید وہ انسان جس نے اپنا نام انیس احمد بتایا تھا، جو لکھنؤ کے ایک بینک میں اکاؤنٹینٹ تھا اور جس کی بائیس سالہ بیوی شادی کے دو برس بعد ہی گزر گئی تھی، شاید پھر دکھائی پڑ جائے، لیکن دکھائی پڑنے سے بھی فائدہ کیا تھا! کیا وہ نقاب الٹ کر کسی مسلم سوشل فلم کی ہیروئن کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی تھی؟

بھائیوں کی شادی کو اماں نے بہت دن ٹالا تھا، لیکن دونوں پردیس میں تھے۔ آخر ان کی شادیاں کرنی ہی پڑیں۔ اب بہن کو لے کر کتنے دن بیٹھے رہتے، پھر اونچ نیچ تو لڑکوں کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے نا۔ قمر کی قسمت پر تو جیسے تالا لگ گیا تھا۔

ایک دن اچانک ایک خاتون وہ تالا کھولنے وارد ہوئیں۔ دو دن پہلے قمر کا اٹھائیسواں سال مکمل ہوا تھا۔ اماں نے اس کی درازی عمر کی دعائیں مانگنے کے بعد آنسو بھری آنکھوں سے اتنا اور کہا تھا: "یا مولا مشکل کشا! کتنی بار دہراؤں؟"

خاتون قدرے پختہ عمر، نک سک سے درست غرارہ پہنے، بڑی شائستہ اور مہذب تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اماں تو مارے خوشی کے پاگل بنی جا رہی تھیں۔

"لڑکا دوہاجو ہے لیکن کم عمر ہے۔ بالکل کنوارا لگتا ہے۔ اے ہے، دکھیا کی شادی کو دو برس ہی تو گزرے تھے۔ بال بچہ بھی نہیں ہے۔ ہوتا بھی تو کیا تھا! کوار کوٹلہ تو بچارہ ہے چھٹنے سے۔"

قمر کا ماتھا بڑی زور سے ٹھنکا۔ تصویر دیکھی تو دانتوں تلے انگلی دبالی۔ اتفاقات صرف فلموں میں نہیں ہوتے، حقیقی زندگی میں بھی رونما ہوتے ہیں۔

"اماں، ہم ان سے ملے تھے۔ جب ہم لکھنؤ جا رہے تھے تب......" کہتے ہوئے قمر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میل ملاقات ہے؟" اماں کا سارا ایکسائٹمنٹ کافور ہو گیا۔ "ہے ہے!"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے، اماں!"

قمر نے سارا لحاظ بھلا دیا، اسے اس قدر غصہ آیا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ پسند کی شادیاں سننے میں نہیں آ رہی تھیں، لیکن جہاں ایسی کسی بات کا سوال ہی نہ ہو وہاں بلاوجہ کی ہے ہے! شادی سے پہلے ماتم! وہ پیر پٹختی چل دی، لیکن پھر کچھ خیال کر کے پلٹی۔ خرد ماغ والدین کا کیا ٹھکانا! کیا پتا اماں محض یہی سوچ کے انکار کر دیں کہ صاحبزادی گل کھلاتی رہی ہیں۔ بھلا کہیں لڑکی خود بر چنتی ہے۔

"ہم قسم کھاتے ہیں، ہمارا اس رشتے میں کوئی دخل نہیں ہے، لیکن ایک بات ضرور کہیں گے کہ رشتہ بہت اچھا ہے، انکار مت کر دینا۔" اس نے بغیر آنکھیں ملائے ہوئے کہا اور کمرے میں گھس گئی۔

جب قمر نے کہا: "ہم قسم کھاتے ہیں" تو اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ وہ اماں پر ضائع نہیں ہوئی۔ انہیں لڑکی پر بڑا ترس آیا، شاید اسے غلط کٹگھرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔

انہوں نے قمر کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا: "بٹیا، ہمیں تم پر بھروسا ہے لیکن ہم جو بھی کہتے ہیں، اس کے پیچھے تمہاری، سب کی عزت کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ لڑکی کی عزت سے زیادہ نازک کوئی شیشہ نہیں۔" قمر نے آنکھیں پٹپٹا کر آنسو پیے۔

حجلۂ عروسی میں قمر نے دولہا سے پوچھا:

"آپ نے ہمیں ڈھونڈا کیسے؟"

"بہت آسانی سے!" دولہا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ کے شہر میں ہماری پہلی سسرال والے تو تھے ہی۔ بڑی آپا کو وہاں بہانے سے بھیج دیا۔ آپ نے اسکول کا نام بتایا تھا جہاں آپ پڑھاتی تھیں۔ آپا وہاں بھی ہو آئیں۔ ساری معلومات چپکے چپکے اکٹھا کر لیں۔"

PDF Compressor Free Version

''ہم نے آپ کی تصویر دیکھی تو ہکا بکا رہ گئے۔ پرتاپ گڑھ کی سڑکوں پر انجانے پر آپ کو ڈھونڈا تھا۔ آپ نے ہم پر بڑا گہرا امپریشن ڈالا تھا۔ ہم نے اماں سے کہہ دیا کہ اس رشتے سے انکار نہ کریں۔''

دولہا بہت خوش ہوا، لیکن کہیں کسی چھٹی حس نے خبردار کیا؛ عورت کو پہلے ہی دن اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہئے۔ اٹھائیس تیس کی ہو رہی ہیں، نوکری کر رہی ہیں، کھائی کھیلی نہ ہوں!

''آپ نے پہلے کسی کو، میرا مطلب ہے، کسی مرد کو اس نظر سے دیکھا تھا؟''

''آپ یقین کرنا چاہیں تو کر لیں کہ نہیں۔''

''اتنی عمریوں ہی گزار دی ہے؟''

''یقین کرنا چاہیں تو کر لیں کہ ہاں۔''

''یونیورسٹی، کالج، اسکول؟''

''جنہیں میں پسند کر سکتی تھی انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا، جنہوں نے دیکھا وہ میرے معیار کے نہیں تھے۔''

''باپ رے!'' انیس نے سوچا۔ ''تو کچھ معاملات تھے!''

''مطلب یہ کہ کچھ لوگوں کو آپ نے پسند کیا تھا؟''

''جو چیزیں میری پہونچ یا بساط سے باہر ہوں، انہیں میں دائرۂ خیال میں نہیں لاتی۔ مجھے معلوم ہے، میں ہیرے نہیں خرید سکتی۔ بلکہ میں تو بھاری سونا بھی نہیں خرید سکتی، اس لئے میں اس کے بارے میں سوچتی بھی نہیں۔ اس موضوع کو یہیں چھوڑ دیجئے۔ ہماری نئی شادی ہوئی ہے، ہم بحث میں کیوں پڑیں!''

اس نے بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کو دیکھا۔

''بولتی بہت ہے'' انیس نے سوچا، لیکن کافی کرید نے کے باوجود دلہن ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ''ضدی بھی معلوم ہوتی ہے۔''

اس نے ایک اور رائے قائم کی اور موضوع بدل دیا۔

''بچوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

قمر گڑبڑا گئی۔ شادی تو ہو نہیں رہی تھی، بچوں کے بارے میں کون سوچتا! تھوڑا توقف کے بعد بولی ''شادی سے پہلے ......شاید کوئی سوچتا ہے کیا؟'' اسے کوئی معقول جواب نہیں سوجھا تھا۔

''اب تو شادی ہو گئی۔'' وہ مسکرایا۔ (کمبخت کی مسکراہٹ بڑی سنجیدہ مسکراہٹ تھی، اس لئے بہت پیاری)

''میڈیکل سائنس کہتا ہے کہ عورت کا پہلا بچہ تیس سال سے پہلے ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ مردوں کے لئے کوئی عمر نہیں شاید۔''

وہ ہنسی۔

''شادی کی ہی طرح۔ ساٹھ برس میں بھی کر لیتے ہیں۔''

''باپ رے! بڑی بے تکلف ہیں۔ بزرگ اسی لئے عورتوں کو زیادہ پڑھانے کے حق میں نہیں تھے۔'' انیس نے سوچا، پھر بولا ''اور کتنے؟''

''دو سے زیادہ نہیں۔ بائی دی وے، ہمیں لڑکا لڑکی کا کوئی ہینگ اَپ نہیں۔'' کہہ کر قمر نے اس موضوع کو بند کر دیا۔ اس طرح کی باتوں کے لئے وقت پڑا تھا۔ یہ اس کی سہاگ رات تھی، اس نے مہندی رچی ہتھیلیاں دولہا کے سامنے پھیلائیں۔

''ہماری اماں بے حد روایتی خاتون ہیں۔ کہتی ہیں، سہاگ کی مہندی بالکل سادہ ہونی چاہئے، کوئی ڈیزائن، پھول پتی کچھ نہیں۔''

''آپ نے ضد نہیں کی پھول بنوانے کی؟''

وہ ہنسا اور دلہن کا ہاتھ تھام لیا۔

''اماں کے سامنے ہماری ضد نہیں چلتی۔ شاید ہی کبھی......''

''میرے سامنے بھی نہیں چلے گی۔'' اس نے بات کاٹی۔

وہی سنجیدہ مسکراہٹ، وہی گہری آنکھیں۔

''دیکھیں گے۔'' وہ ہنسی۔ ''آپ کو ایک دلچسپ قصہ سنائیں؟''

''ضرور آج آپ کا جتنا جی چاہے بول لئے، ہم سنیں گے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''اماں کی شادی کے وقت ان کے مائیکے میں تو جوان رشتہ دار عورتوں نے ایک رسم کی۔ انہوں نے اماں کی مٹھی میں ایک انگوٹھی بند کرائی اور ابا سے کہا، مٹھی کھول کر انگوٹھی نکالیں۔ اماں دھان پان سی تھیں اور صرف سترہ برس عمر۔ ابا کو ڈر رہا ہوگا کہ کہیں کلائی میں موچ نہ آ جائے، اس لئے زیادہ زور آزمائی نہ کی ہوگی۔ نہیں کھلوا سکے۔ عورتوں نے شور مچا دیا کہ دولہا کمزور ہے، دلہن حاوی رہے گی۔ ابا نے

PDF Compressor Free Version

بڑی سنجیدگی سے کہا 'کھیل مذاق کی بات اور ہے، جہاں تک مٹھی کھلوانے کا سوال ہے کہیے ابھی کھلوادیں' 'کھلوایئے!' شور بلند ہوا۔ ابا نے نہایت سنجیدگی سے کہا 'فاطمہ بی بی، میں آپ کو آپ کے شوہر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ آپ اپنی مٹھی کھول دیں۔' گٹھری بنی اماں نے پٹ سے مٹھی کھول دی جس میں انگوٹھی چمچما رہی تھی۔ محفل پر سناٹا طاری ہوگیا۔''

(''لیکن شاید کہیں تفریح بھی سناٹے میں گم ہوگئی'' یہ قمر نے دل میں سوچا۔)

لمحہ بھر کو تو انیس بھی خاموش رہ گیا۔ وہ شاید اس ''پنچ لائن'' کے لئے تیار نہیں تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا:

''حکم دینے کی مجال تو نہیں، درخواست ہے قمر النسا بیگم، کہ ہماری دلہن کی حیثیت سے آپ ہمارے اور قریب آجائیں۔''

اس بار اس کی مسکراہٹ بہت گہری تھی اور اس کی سنجیدگی کی جگہ شرارت نے لے لی تھی۔ قمر شرم سے سرخ ہوگئی۔ (اور دولہا نے سوچا ''چلو، اتنا تو ہے کہ لاج شرم بالکل ہی بیچ نہیں کھائی ہے۔'')

انیس کی درخواست اب کچھ حد تک حکم میں بدلتی جارہی تھی اور قمر کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ، کہ تم نے گارنٹی لی ہے کہ ہمارے یہاں بیٹا ہوگا؟

''ہمارے پڑوس میں وہ تھے نا دلشاد چچا۔ ان کے یہاں ساتویں بھی بیٹی ہی ہوئی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، ماں باپ کے چہرے پر ہمیشہ یتیمی برستی رہی۔ اوپر سے چچا مرے تو دو بیٹیاں ابھی بن بیاہی رہ گئی تھیں۔''

''ہم سات کے لئے تو نہیں کہہ رہے، تمہارے دلشاد چچا سے ہمیں کیا لینا دینا؟''

''تیسری کے لئے بھی کیوں کہہ رہے ہو؟ پالو گے؟ پالنا تو ہمیں ہی پڑے گا۔''

''اگر تیسرا بچہ بھی لڑکی ہی ہوا تو......ہم اسے بھیا کو دے دیں گے۔ بھیا بھابی تو لپک لیں گے گھر کے بچے کو۔'' (انیس کے بڑے بھائی لاولد تھے۔)

''معاف کرنا، سنا ہے ڈاکٹری معائنے سے نقص بھیا میں ظاہر ہوا تھا۔'' انیس بھڑک گیا۔

''یہاں اس کا کیا ذکر ہے کہ نقص کس میں تھا؟ بات کو ٹالو مت اور اٹھا کے پھینکو وہ اپنی گولیوں کی شیشی۔ بیٹا ہوا تو ہمارا، لڑکی ہوئی تو بھیا بھابی کی۔''

''ہرگز نہیں! میرے جسم پر صرف میرا حق ہے۔ میری اولاد میری رہے گی۔ اگر میں نے تیسرا بچہ پیدا کیا بھی تو لڑکا ہو یا لڑکی، اسے میں ہی رکھوں گی۔ تمہاری کسی بات سے میں نے انکار نہیں کیا۔ ہمیشہ مصالحت کا راستہ اپنایا۔ ملازمت کے علاوہ سخت محنت کرکے ٹیوشن بھی کر رہی ہوں کہ بچیاں اچھے اسکول میں پڑھیں۔ گھر کا معیار اونچا رکھنے میں میری محنت بھی شامل ہے۔ اب کہیں کچھ تو ہو جو صرف میرا ہو۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ انیس آخری جملے پورے ہونے سے پہلے اٹھ کر جا چکا تھا۔

قمر نے گولیوں کی شیشی نہیں پھینکی، لیکن کہیں کچھ تھا جو چھن سے اس کے اور انیس کے درمیان ٹوٹ گیا تھا۔ قمر کے تئیں اس کے اندر ایک سردمہری گھر کر گئی تھی جو بڑی تکلیف دہ تھی۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' سوچتے سوچتے وقت یونہی گزرتا رہا اور کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ انیس ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلاتا، طعنے دیتا۔ اس کے جن کاموں سے ہمیشہ مطمئن رہتا تھا ان میں بھی عیب نکالتا۔ دانت پر دانت بھینچ کر قمر برداشت کرتی رہی۔ اماں قمر کو تتیا مرچ کہا کرتی تھیں، لیکن اس کی ساری تیزی انیس کی سردمہری کے سامنے ہوا ہوگئی تھی اور اب تیسرے بچے کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔

گھر میں آج کل رولا مچا ہوا تھا۔ رضوانہ نے پلس ٹو کا امتحان دے دیا تھا۔ باپ کی ضد پر اس نے سائنس لے لیا تھا، لیکن اب پری میڈیکل امتحانوں میں بیٹھنے سے صاف انکار کر رہی تھی۔

''ہمیں ڈاکٹر نہیں بننا۔'' بس مرغے کی ایک ٹانگ۔

''تو کیا بننا ہے؟ آج کل سمپل گریجویٹ کی کہیں کھپت نہیں۔''

''کھپت تو اس کی بھی ہے، پاپا۔ آج کل بہت ایونیوز ہوگئے ہیں، لیکن ہاں، ہمارا ایک ٹارگٹ ہے۔ ہم اکنامکس اور انگلش لے کر

PDF Compressor Free Version

گریجویشن کریں گے اور اس کے بعد لا پڑھیں گے۔"

لڑکی وکیل بنے گی؟ لوگ سکتے میں آ گئے۔ اسے باز رکھنے کی ایک پوری مہم چل پڑی۔ گاؤں سے انیس کی والدہ آ گئیں پوتی کو سمجھانے۔ بڑے بھائی اور بھابی تو لکھنؤ میں ہی رہتے تھے۔ ذرا دور رہا کرتے تھے اس لئے کم آتے تھے، لیکن ادھر کئی دن سے روز آ رہے تھے۔ "بیٹا، ہماری کوئی اولاد تو ہے نہیں۔ ایک اچھا خاصا پلاٹ زمین کا ہے۔ ہم تو سوچتے تھے، تم ڈاکٹر بنو گی تو تمہیں وہاں نرسنگ ہوم بنوا دیں گے۔"

"اب بڑے ابا، آپ کے اس پلاٹ کو استعمال کرنے کے لئے ہم مرضی کے خلاف ڈاکٹر بن جائیں؟ چلئے اچھا، اس پر ہمارا دفتر بنوا دیجئے گا۔ 'رضوانہ احمد ایڈووکیٹ' کا بورڈ لگ جائے گا۔"

"رضوانہ احمد ایڈووکیٹ سے لڑکے کانوں پہ ہاتھ لگا کے بھاگیں گے۔" بڑی چچی نے جل کے کہا۔ وہ اپنی اتنی قیمتی زمین دیور کی اولادوں کو دئے جانے کے خیال سے ہی کبیدہ خاطر ہو جاتی تھیں۔

"اچھا ہے نا بڑی اماں، لڑکی سے دور ہی رہیں گے۔"

اب کی دادی کود پڑیں اور نہایت ناراض ہو کر، "کیا بری باتیں منہ سے نکالتی رہتی ہے۔ ارے شادی بیاہ کرنا ہے کہ نہیں؟ چلیں وہاں سے۔ لڑکی ڈاکٹر بن جاتی ہے تو لڑکے والے دوڑ کے ہاتھوں ہاتھ لے جاتے ہیں۔"

"ہاں! اب تو مسلمانوں میں بھی جہیز کا اتنا چلن ہو گیا ہے۔" قمر نے بھی ٹھنڈی سانس لے کر دبی زبان سے کہا۔

"اور جہیز ہو نہ ہو، وکیل لڑکی کے نام پر تو لڑکا ویسے بھی نہ ملے گا۔" یہ انیس تھا۔

"لڑکی کی بات چھوڑو میاں!" بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔ "ہم تو جانتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست ایڈووکیٹ ہیں۔ ارے وہی علی رضا، جانتے ہو گے۔ ان کی لڑکی کی کہیں بات چلائی گئی تو لڑکے کے والد نے کہا، نہ بھائی، وکیل کی بیٹی نہ لائیں گے۔"

وہی مرغے کی ایک ٹانگ! سب کی تان شادی پر کیوں ٹوٹتی ہے؟" رضوانہ نے نہایت خفا ہو کر کہا: "نہیں کرنی ہے ہمیں شادی۔"

"مرغے کی ایک ٹانگ تمہاری کہ دوسروں کی؟ آخر تم کیوں اڑ گئی ہو وکالت پہ؟"

"ہمیں اس میں دلچسپی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اندر صلاحیت بھی ہے۔ اچھا، گریجویشن تو کرنے دیجئے۔ اس کے بعد بہت کچھ ہے۔ جرنلزم کر لیں گے، یو پی ایس سی دے لیں گے۔ کہیں نہ آئے تو بی ایڈ کر کے آپ کی طرح جھک ماریں گے۔ اسکول میں پڑھائیں گے ماسٹرائن بن کے۔"

اس کے لہجے میں استہزا تھا۔ قمر کو کہیں بہت تکلیف پہونچی۔

"ماسٹرائنیں اگر تمہیں نہ پڑھائیں تو تم آگے آگے اتنا کود گی کیسے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا، لیکن اوپر سے پرسکون رہی۔ یہ مکالمے ایک دن کی بات نہیں تھے، کئی دن سے چل رہے تھے۔

آخر لوگوں کو ہار ماننی پڑی۔ رضوانہ کا یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی میں داخلہ ہو گیا اور لوگوں کو مزید ہار یہ ماننی پڑی کہ ان تین سالوں میں اسے "برین واش" کرنے کی سب کوششیں بیکار رہیں۔ اس نے بی اے کے بعد علی گڑھ میں لا کورس جوائن کر لیا۔ قمر کی ساس رہتی تو بارہ بنکی کے گاؤں میں تھیں، لیکن اکثر آتی رہتیں اور جب آتیں، رضوانہ کو لے کر قمر کو باتیں سنا کر جاتیں:

"لڑکی کو بہت آزادی دے رکھی ہے اور پڑھاؤ انگریزی اسکولوں میں۔ یہ کرسٹان، انہوں نے ہماری تہذیب کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ماں باپ بے فکر ہیں، لڑکی دندناتی گھوم رہی ہے۔"

پھر انہیں اچانک خیال آیا کہ 'باپ' کہہ کر وہ اپنے بیٹے کو بھی بیٹی کو بگاڑنے میں ملوث کر رہی ہیں اس لئے جلدی سے بولیں۔ "اب باپ بیچارہ کرے بھی تو کیا۔ وہ تو دن بھر گھر سے باہر رہتا ہے۔ بچوں کی تربیت تو ماں کا کام ہے۔ انہیں غلط راستے پر چلنے سے روکنا بھی ماں کا ہی کام ہے اور یہ چھوٹی فتنی! اری تو کیا کرنے والی ہے ری عمرانہ؟"

"ماس کوم (Masscom) دادی" چھوٹی فتنی نے نیل فائل سے ناخنوں کو گھس کر حسب مرضی شیپ دیتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

یہ آج کل کی لڑکیاں کتنے اطمینان سے اپنا کریئر طے کر رہی

PDF Compressor Free Version

ہیں اور کتنا واضح مقصد ذہن میں رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے سب کا نہ بھی ہوتا ہو، لیکن اچھے اسکولوں سے جو لڑکیاں پڑھ کر نکل رہی ہیں ان میں سے زیادہ تر نہایت صاف سوچ رکھتی ہیں اور لڑکے بھی تو۔ ہمارے تو اماں ابا بس اسکولوں میں نام لکھوا کر بے فکر ہو جایا کرتے تھے۔ نہ کبھی ہوم ورک دیکھیں نہ یہ سوچیں کہ بچے کریں گے کیا۔ بس بے نتھے بیل کی طرح بی اے، ایم اے کرلو، پھر لڑکے جوتیاں چٹخائیں نوکریوں کے لئے اور لڑکیاں شادی کے انتظار میں گھر میں سوکھیں۔ ہم نے لاکھ چاہا تھا کہ سائنس پڑھ لیں، لیکن ہمارے گھر میں لڑکیوں کے اسکول میں تھا ہی نہیں اور ہائی اسکول کے فوراً بعد اماں قطعی باہر بھیجنے کو راضی نہیں تھیں۔

''ارے یہاں جو پڑھ رہی ہیں وہ گھاس کھود رہی ہیں کیا؟'' ان کی یہی ایک دلیل تھی۔ دراصل وہ اس پھیر میں تھیں کہ انٹر کے بعد قمر کی شادی ہو جائے گی۔ شادی نہ ہونے پر مجبوری میں گریجویشن کے لئے الٰہ آباد بھیجا۔ دور کی جگہ نوکری کے لئے نہیں جانے دیا۔ قمر نے نظریں اٹھا کر عمرانہ کو دیکھا اور سوچتی رہی کہ ماس کوم تو لکھنؤ میں ہے ہی نہیں۔ ایل ایل بی یہاں ہوتے ہوئے بھی رضوانہ علی گڑھ چلی گئی تو ان صاحبزادی کو تو باہر جانا ہی ہے۔ دلی جائیں گی اور کیا۔ کہیں بمبئی نہ چل دیں۔ اس کا دل جیسے چکو لے کھانے لگا۔ بمبئی تو بھائی، ہمیں برداشت نہ ہوگا۔

رضوانہ نے علی گڑھ سے خط لکھا تھا۔

قمر کی جان جل گئی۔ کتنی بار کہا کہ انگریزی میں خط مت لکھا کرو۔ ٹھیک ہے، تمہاری ماں پڑھی لکھی ہے، انگریزی داں ہے، لیکن اگر اب ہم لوگ بھی آپس میں انگریزی استعمال کرنے لگیں تو اردو کا کیا ہوگا؟ ٹھیک کہتی ہیں انیس کی ماں کہ انگریز چلے گئے، تم لوگوں کو چھوڑ گئے۔ مارے غصے کی جی چاہا، خط واپس لفافے میں ڈال کے اسے بھیج دے، لیکن تجسس اور بیٹی کی محبت غالب آگئی۔ ساری زندگی تو معاف کرتے کرتے ہی گزر رہی تھی۔ اس نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ مختصر ہی تھا۔ بس دو پیراگراف۔ آخر تک پہنچتے پہنچتے قمر کے جسم میں کچھ سن سن کرنے لگا۔ تردد، گھبراہٹ، اندیشے۔ کیا بیٹوں کی پیدائش پر تھالی کٹورا پیٹنے اور بیٹیوں کی پیدائش پر منہ لٹکانے والے لوگ حق بجانب ہوتے ہیں؟ وہ کاغذ ہاتھ میں پکڑے، خلا میں دیکھنے لگی۔ رضوانہ نے لکھا تھا:

بمبئی کی ایک لافرم میں بڑی اچھی ملازمت ملنے کے پورے امکانات ہوگئے ہیں۔ بس رسمیات پوری کرنی ہیں۔ وہ انٹرویو کے لئے بمبئی جا رہی ہے۔ بمبئی؟ اکیلے؟ اور اگر نوکری مل گئی تو کہاں رہے گی؟ کیسے رہے گی؟ علی گڑھ میں تو کالج کا اپنا گرلز ہوسٹل تھا۔ دوسرے کہیں تحت الشعور میں ایک موہوم سی امید تھی کہ وہاں مسلمان لڑکے بہت ہیں، شاید کہیں وکالت پڑھنے والے کو ہم پیشہ لڑکی پسند آجائے، لیکن بمبئی!?That big bad metro! سے چکر سا آنے لگا۔

''کس کا خط ہے؟'' انیس نے قریب آکر پوچھا۔ ''فکرمند کیوں لگ رہی ہو؟'' اس نے خط شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے لڑکی کا۔ علی گڑھ جانے دیا تو اور پر نکل آئے۔'' انیس سخت ناراض ہوا تھا۔ مردوں کو شاید ایک ہی جذبے کا اظہار کرنا بہت اچھی طرح آتا ہے، غصہ۔ نہ پریشانی نہ گھبراہٹ نہ محبت، لیکن کیا یہ ناراضگی محبت کا ہی مظہر نہیں تھی؟ محبت کا اور سروکار کا؟ لڑکی کے تحفظ کی فکر، اس کی عزت آبرو کی فکر، اس کا گھر بسانے کی فکر؟ پڑھ لکھ لیا، اس لائق ہوگئیں کہ ضرورت پڑے تو اپنے ساتھ چار اور لوگوں کی کفالت کرلیں۔ اب بھیا اپنے گھر بار کی ہو جاؤ، پھر جو جی چاہے کرو۔ قمر دل میں یکتی جھکتی رہی۔

ابھی ای میل اور فیس بک کا زمانہ کچھ دور تھا۔ موبائل خال خال لوگوں کے پاس تھے، اس لئے رضوانہ نے اپنی دوست میرا کو بھی خط ہی لکھا جو لکھنؤ میں ہی تھی۔ رضوانہ کی ہم عمر تھی، لیکن دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

''میں نے مما سے کہہ دیا ہے، بمبئی جا رہی ہوں انٹرویو کے لئے۔ وہاں میرے ایک کلاس فیلو کے چاچا چاچی ہیں۔ دو دن ان کے یہاں ٹھہروں گی۔ اگر ملازمت مل گئی تو وہیں پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہنے کا انتظام بھی کرا دیں گے۔ مجھے معلوم ہے، پاپا گھوم گھوم کر مجھے اور مما دونوں کو برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔ مما دعائیں مانگیں گی۔ شاید منت بھی مان لیں کہ نوکری نہ ملی تو حضرت شاہ مینا کی درگاہ پہ جا کے چادر چڑھا کے آئیں گی۔ پتا ہے میرا، مما پکی وہابی تھیں۔ وہابی تو نہیں

PDF Compressor Free Version

جانے گی، بس یوں سمجھ لے، جو لوگ پیر فقیر دھاگا تعویذ وغیرہ میں یقین نہیں رکھتے، لیکن جب سے میں اور عمرانہ گھر سے باہر نکلے ہیں وہ یہ سب کرنے لگی ہیں، اپنی دانست میں پڑھی لکھی، میری روشن خیال ماں۔ قسم سے میرا، مجھے ان میں اور نانی میں خاص فرق نظر نہیں آتا۔

''اچھا یہ بتا، اتنی جلدی دوبارہ کیسے پھنس گئی؟ اور اگر اس بار بھی بیٹی ہوئی تو کیا کرے گی؟ سنجے کا کیا خیال ہے؟ اس کی اماں نے پچھلی بار کتنا واویلا مچایا تھا۔ اس بار کہیں سنجے بھی اماں کے ساتھ مل کر تجھے پیٹے گا تو نہیں دوبارہ بیٹی پیدا کرنے پر؟''

میرا نے جواب دیا: ''رشک آتا ہے تیرے اوپر۔ جاگھوم چھٹا سانڈ بن کے۔ رہا اماں اور نانی میں فرق، تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ میری اماں بنارس ہندو یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے ہیں۔ پاپا کھانا کھاتے ہوتے ہیں تو گرم پھلکا پلیٹ میں ڈالتی ہیں، پھر بیچ سے آدھا کھایا پھلکا ہٹا کر، کہ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا، دوسرا جلدی سے لا کے ڈالتی ہیں۔ بچا ہوا آدھا اٹھا کے اپنی پلیٹ میں رکھ لیتی ہیں، پھر بیٹھ کے وہ دو تین آدھے آدھے ٹکڑے پرساد سمجھ کے کھا جاتی ہیں۔ ('پرساد سمجھ کے' میں کہہ رہی ہوں) پیر فقیر تعویذ گنڈا کرتی گھومتی ہیں۔ تم مسلمان تو ہندوؤں کے سادھو سنتوں کے پاس جاتے نہیں، اماں تو سیدھی حضرت شاہ مینا کے یہاں پہنچتی ہیں۔ دلی گئی تھیں تو میری شادی سنجے سے ہوجائے اس کے لئے حضرت نظام الدین منت مان کے آئی تھیں۔ ان کی رینج زیادہ وسیع ہے۔ ہم کچھ نہیں مانتے ہیں، پھر بھی لگتا ہے کہ کہیں کچھ ہوا تو؟ ہم نے بھی منگل کو ہنومان مندر جانا شروع کر دیا ہے۔ اس بار بیٹا ہوجائے تو فیملی مکمل ہوجائے گی۔ جھنجھٹ سے بچیں گے، ورنہ ایک بار پھر..... بچے پل جائیں تو ہم بھی کچھ کریں۔ بڑا غصہ آتا ہے۔ اماں نے ماسٹرز کی ڈگری لی، لیکن ہمیں بی اے کا امتحان دینے سے پہلے بیاہ دیا کہ بڑے گھر کا انجینئر لڑکا مل رہا تھا۔ ہم ایسے گئے گزرے تھے؟ پھر نہ ملتا کیا؟ مگر چل، ٹھیک ہی ہے جو ہو رہا ہے۔ دو چار سال بعد ضرور ہم کچھ کریں گے۔ جا تیرا کلیان ہو، تجھے نوکری مل جائے۔ بول تو جا کے ہم ہنومان جی سے تیرے لئے بھی پرارتھنا کر آئیں، مگر بڑی مشکل ہوجائے گی اگر قمر چاچی نے حضرت شاہ مینا کے یہاں جا کے دھاگا باندھ دیا۔ ہندوستان پاکستان والی Tussle ہوجائے گی۔ ہاہاہا! اور ہاں! بغیر ٹھوکے بجائے شادی کے لئے ہاں مت کیجیو۔ ایسی قسمت کم ہوتی ہے کہ سنجے جیسا میسنا مل جائے۔ (ویسے ماں جی آئی ہوئی ہوتی ہیں تو وہ بھی خاصا شیر بنا رہتا ہے۔)''

قمر نے بیٹی کو لکھا: ''بیٹا، ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ تعلیم ہوگئی۔ نوکری کہیں نہیں جائے گی۔ تم تو پریکٹس بھی کر سکتی ہو۔ لکھنؤ میں اچھے اچھے وکیل پاپا کی جان پہچان میں ہیں۔ اب شادی ہونی چاہئے۔ رشتے سامنے ہیں، ایک خوشگوار ازدواجی زندگی سے زیادہ سکون بخش اور کچھ نہیں۔ دھن دولت سے بھی زیادہ دل کا سکون اہم ہے۔ ساری تحقیقیں، سارے سروے اسی مغرب سے آتے ہیں جس کی تعلیم سے تم متاثر ہو، تو تم نے پڑھا ہی ہوگا کہ کئی سروے ہوئے ہیں اور نتیجہ یہی سامنے آیا ہے کہ کنوارے، طلاق شدہ اور رنڈوے شادی شدہ لوگوں کی بہ نسبت کم عمر پاتے ہیں۔ کبھی سوچا کہ کیوں؟ اس لئے کہ جوڑا بنا کر رہنے میں جو طمانیت قلب ملتی ہے وہ عمر تک بڑھا دیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑے، اونچ نیچ، سب کے باوجود۔ تو بیٹا، گھر آجاؤ، ہم نے سوچا تھا، ہماری شادی دیر سے ہوئی، ہم بیٹی کی شادی وقت سے کریں گے۔ تم ہم سے زیادہ Privileged Position پر ہو۔ دیر تم خود کرا رہی ہو۔ ایک تو تمہاری یہ وکالت.....''

رضوانہ نے یہاں تک پڑھ کر خط اٹھا کر کتاب تلے دبا دیا۔ ''کتنا بولتی ہو ممی! کتنا دماغ چاٹتی ہو۔'' انٹرویو ہو چکا تھا اور نہایت تشفی بخش۔ اس نے انگڑائی لی اور میرا کو پھر خط لکھنے بیٹھ گئی۔

''مما ادھ کچری معلومات لے کر میرا دماغ خراب کرتی رہتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے، ان کی ازدواجی زندگی کتنی خوشگوار گزری؟ وہ خوشگوار کسے کہتی ہیں؟ مجھے دل کے لائق لڑکا ملا تو کیا شادی نہیں کروں گی؟ بمبئی جانے اور مردوں کے بیچ مردوں والی نوکری کرنے کو وہ ویمیز لب قرار دے رہی ہیں۔ میں کیا بمبئی کے ساحل پر ننگی ہو کر دوڑ لگانے والی ہوں؟ میرا ارادہ اپنی برا جلانے کا بھی قطعی نہیں ہے۔ برا سے سپورٹ پا کر فگر اور خوبصورت ہوجاتا اور سیکسی لگتا ہے۔ مما سے کہوں؟ ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ ہاہاہا! اور مما کو ایک بات سے

PDF Compressor Free Version

اور ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ میں سمیر کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تھی۔ سمیر نام مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے، لیکن وہ تیرا جات بھائی ہے۔ ہندو تو ہے ہی، برہمن بھی ہے۔ مزید ہاہاہا! لیکن تو بھی ایسی ویسی بات نہ سوچنا۔ میرا ارادہ تیری بھابی بننے کا قطعی نہیں ہے۔ مما کی سمجھ میں کسی لڑکے اور لڑکی کی ایسی دوستی ہرگز نہیں آئے گی جس میں وہ..... ارے وہی..... مرد عورت والا معاملہ نہ ہو۔ سمیر اور میں اچھے دوست ہیں۔ ویسے وہ بھی کہہ رہا تھا کہ ماں کو فون کر کے کہہ دوں کہ رضوانہ کے ساتھ ایک بیہودہ سی انگریزی فلم دیکھ کر آیا ہوں تو واویلا مچا کے رکھ دیں گی۔ لونڈیوں کے ساتھ گھومنا ہوتا ہے، وہ بھی میاں مسلمان! وہ ویجیٹیرین ہیں۔ کرم کانڈی سناتن دھرمی! بسنت کی خبر نہیں۔ بیٹا ایک بار اشوکا میں جا کے بیف کھا کے آیا تھا۔ ایک نمبر کا حرامی! اور ہاں، انہوں نے الٰہ آباد سے ہندی میں آنرز کیا ہے۔ مہادیوی ورما کی فین ہیں۔ ارے یار، یہ مہادیوی ورما کون ہیں؟ ذرا میں بھی پڑھ کے دیکھوں۔ کبھی ملاقات ہوئی تو کامن ٹاپک تو ہوگا بات کرنے کو۔ ارے جاہل کی بچی! بچے کی جنس تو حمل ٹھہرتے ہی طے ہو جاتی ہے۔ اب یہ تو ہنومان جی سے کیا پرارتھنا کرتی گھوم رہی ہے؟ وہ کیا کریں گے؟ لنگوٹ دھاری، برہمچاری۔ انہیں کیا، تو بیٹی جن کہ بیٹا۔''

میرا نے جواب میں لکھا: ''سمیر وہی نا جو ابھی یو پی ایس سی کی تیاری کر رہا ہے؟ تو اس کا نام پہلے بھی لے چکی ہے۔ ہونے والی ساس کے بارے میں خاصی معلومات اکٹھا کر رکھی ہیں۔ اچھی بہو بنے گی۔ زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ بیٹی لانا آسان ہوتا ہے، بیٹی دینا مشکل۔ سبھی جاتوں برادریوں میں۔ قمر چاچی اور انیس چاچا کو زیادہ دقت ہو جائے گی یہ سوچ کے رہنا۔ سمیر کی اماں تیرے منہ میں پنچامرت ڈال کے شدھی کرائیں گی۔ ذرا دھیان رکھنا، گوبر اور گوموتر بھی پنچامرت میں آتے ہیں اور مہادیوی ورما کو تو کیا سمجھے گی، انہیں تو میں بھی نہ سمجھ پائی۔ ہاں! اپنی ہم نام میرا کو جانتی ہوں: جو میں ایسا جانتی پریت کے دکھ ہوئے، نگر ڈھنڈورا پیٹتی مت پریت کریو کوئے۔''

''تیری تو ایسی کی تیسی!'' رضوانہ نے ہنس کر خط تہہ کر کے چائے کے کپ سے دبا کر میز پر رکھ دیا۔ وہ انٹرویو میں کامیاب رہی تھی۔ فرم نے جواب دیا تھا کہ تھرڈ ایئر مکمل ہونے کے بعد وہ وہاں آ کر جوائن کر سکتی ہے۔ وہ بے حد خوش، کامیابی کے نشے میں سرشار علی گڑھ واپس آئی تھی اور تندہی سے پڑھائی میں جٹ گئی تھی۔ میرا بائی! تمہارے وقت میں لڑکیاں وکالت نہیں پڑھا کرتی تھیں ورنہ زہر بھیجنے والے رانا جی کا گلا دبا دیتیں۔ تمہیں عشق حقیقی پریشان کرتا نہ عشق مجازی۔ مزے سے ہماری طرح دندناتی پھرتیں کہ ہم صرف اپنے آپ سے عشق کرتے ہیں۔ ارے ذرا رکو تو! ہاں، تھوڑا مما سے، ذرا سا پاپا سے، تھوڑا سا اس عمرانہ کی بچی سے اور ایک پاؤ بچا کے رکھا ہے۔ اس میں نانی دادی اور میرا کا حصہ ہے اور اس بیہودہ سمیر کا بھی، مگر ابھی ہمیں ایسا عشق کسی سے نہیں ہے کہ ہم کہیں، پریت کیے دکھ ہوئے۔'' اس نے خوشی سے کلکاری مار کر بستر پر ایک لوٹ لگائی اور قانون کی موٹی سی کتاب تھپ سے بند کی جو وہ دیر سے پڑھ رہی تھی۔

اس دن قمر سارے دن اتنا پریشان رہی تھی کہ شام کو اسے سر درد کی گولی کھانی پڑی۔ انیس آفس سے ابھی نہیں آیا تھا۔ اس نے چائے کے برتن ٹرے میں لگائے، ناشتے کا انتظام کیا اور اون سلائیاں اٹھا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ انیس کا سوئٹر نصف مکمل ہو چکا تھا۔

جاڑوں کی آمد آمد تھی۔ فضا میں بڑی پیاری سی خنکی تھی اور گلابی جاڑوں کی خوشبو۔

جاڑوں کا اگر رنگ ہو سکتا ہے تو یقیناً ان کی خوشبو بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ذہنی پراگندگی کے باوجود مسکرا پڑی۔ ہاں! خوشبو ہوتی تو ہے۔ ہرے دھنیے کی، تازہ ہری سبزیوں کی جو گرمیوں میں عنقا ہو جاتی ہیں، رات بھر پک کر صبح صبح تیار ہونے والی نہاری کی، بھوبل میں بھنتی شکر قندیوں کی اور رنگ و بو ہی نہیں، جاڑوں کی تو آواز بھی ہوتی ہے۔ کڑک کڑک کر کے دانتوں تلے ٹوٹتی گزک اور ریوڑیوں کی، مونگ پھلیوں اور چلغوزوں کی، گہراتی شام میں دور بجتے کسی درد بھرے نغمے کی، ٹھنڈی یخ راتوں میں سرسر کر کے آتی ہوا کی اور بزرگوں کی شفقت بھری ڈانٹ کی کہ سر ڈھکو، سر سے ٹھنڈ زیادہ اثر کرتی ہے اور اس پر بچوں اور نوجوانوں کی ہی ہی ٹھی ٹھی کی، کہ کہاں کی ٹھنڈ، کون سی ٹھنڈ۔

PDF Compressor Free Version

اس کا دل یکلخت ایک بے وجہ اداسی سے بھر اٹھا۔ جاڑوں کا رنگ گلابی تھا، لیکن آس پاس آوازیں نہیں تھیں۔ آوازیں تو انسانوں سے ہوتی ہیں۔ وہ قلقل مینا جیسی ہنسی کہاں تھی؟ دادی کی کہانیاں کہاں تھیں؟ ان کی حماقت بھری باتوں اور کبھی کبھی کی بے جا ڈانٹ کے باوجود ان کے سایہ دار وجود کا احساس کہاں تھا؟ بچے کہاں تھے اور جوان کہاں غائب ہو گئے تھے؟

انیس کے کبھی کبھار آ نکلنے والے والدین اب زیادہ بوڑھے ہو کر گاؤں میں ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اماں کو تو بیٹی کے یہاں کا پانی پینا بھی گوارا نہیں تھا۔ ایک دو بار دو چار روز کے لئے آئی تھیں کہ عزیز از جان بیٹی کو گھر، شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش دیکھ لیں۔ دیکھ لیا۔ بس، اب ملنا ہے تو قمر جا کے مل آئے۔ وہ تو بیٹوں تک کے گھر جا کے رہنے کو تیار نہیں تھیں، بس زچگی جا پے نمٹا دیتیں، ہفتہ دس دن یوں بھی جا کے رہ آتیں کہ بیٹوں کے یہاں بار بار جانے یا ہفتہ دس دن رہ آنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ کس سے کہے اور کیا کہے۔ رضوانہ نے بے حد سمجھانے اور باپ کے ناراض ہونے کے باوجود بمبئی جا کر ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے انیس کے زیادہ ناراض ہونے پر اس نے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ کوشش کرے گی کہ بمبئی چھوڑ کر دلی یا پھر (بادل نخواستہ) لکھنؤ آ جائے، لیکن فی الحال تو جوائن کرنا ہی ہے۔ کسی دوست کی معرفت ایک کنبے میں پیئنگ گیسٹ بن کر رہنے کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ یہ ایک پارسی کنبہ تھا۔ ادھیڑ سے کچھ آگے بڑھتی عمر کے والدین اور ان کی پانچ اولادیں، جن میں دو جوان لڑکے تھے۔ قمر نے جس دوست کی معرفت کا ذکر کیا تھا وہ خود بھی لڑکا ہی تھا۔ سمیر، اللہ جانے ہندو تھا کہ مسلمان۔ اب یہ نام ایسا دورخا ہے کہ کچھ پتا نہیں چل رہا۔ کاش کوئی اچھا مسلمان لڑکا ہو۔ لڑکے کی معرفت اس نے مدد کی بات تو کی، لیکن اس کا نام قمر انیس سے چھپا لے گئی تھی۔ کہہ دیا، رضوانہ کا خط کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ رضوانہ اتنی ضدی کیوں ہے؟ ضدی اور بدتمیز۔ کیا میری پرورش میں کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے؟ سوچتے اور کرسی آگے پیچھے جھلاتے ہوئے قمر نے آنکھیں بند کر لیں۔

اماں میرے لئے بھی یہی کہتی تھیں کہ میں ضدی اور بدتمیز ہوں۔ شاید خود سے یہی سوال بھی کرتی ہوں گی کہ کیا ان کی پرورش میں کہیں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ میں نے بی ایڈ کرنے کی ضد کی تھی، بی اے کے بعد گھر بیٹھے رہنے سے انکار کیا تھا، بال کٹوا دئے تھے، ایک موٹے لڑکے سے، جو اماں ابا کے حساب سے باقی اور پہلوؤں سے صحیح "میچ" تھا، شادی سے انکار کیا تھا، شلوار کی مہریاں تنگ کی تھیں اور قمیص کا گھیر کم کر کے آستینیں اڑا دی تھیں اور ٹیڈی تو نہیں، لیکن لگ بھگ ٹیڈی لباس پہنا تھا۔

قمر یکلخت اُنس پڑی۔ ایک بار وہ چھٹیوں میں گھر آئی تو اس نے جھاڑ پونچھ کر سلائی مشین نکالی۔ تیل ڈال کر اسے دن بھر کو چھوڑ دیا۔ اماں خوش ہوئیں کہ بیٹی کچھ سلائی پرائی کرنے جا رہی ہے۔ کافی دن سے کہہ رہی تھیں کہ بھائیوں کے لئے پاجامے سی دے، لیکن دوسرے دن قمر قینچی اور اپنے کئی جوڑے لے کر بیٹھی تو بڑی ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے اماں نے اسے دیکھا۔

"اوئی بیوی، کیا کرنے جا رہی ہو؟ میں تو سمجھی، نیا کچھ سینا ہے۔"

"اماں، ہمارے کپڑے بڑے جھولا جیسے ہیں۔ شلوار کے پائینچے اتنے چوڑے نہیں پہنے جا رہے ہیں۔ ہمیں بڑی خفت ہوتی ہے۔ قمیصیں بھی اتنی لانبی چوڑی نہیں رہ گئیں۔"

"تو.....؟"

"تو کیا اماں؟ کاٹ کے شلوار کی مہریاں ذرا کم کر دیں گے اور قمیصوں کو بھی چھانٹ دیں گے اور اماں، اب ہم دو جوڑے کپڑے الہ آباد میں درزی سے سلوائیں گے۔ تم ہمارے کپڑے سیتی ہو یا ہم خود سیتے ہیں تو صاف پتا چلتا ہے کہ گھر کے سلے ہوئے ہیں، فٹنگ کا نام نہیں۔"

"جو جی چاہے کرو، بس آپے میں رہنا۔ لباس میں ننگاپن نہ آئے، ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

قمر نے غصے میں قینچی پٹخی: "ہر چیز میں الٹا ہی سوچتی ہو۔ اب ننگاپن کہاں سے آ گیا؟"

"ہاں، دیکھا نا ننگاپن۔ سنا، بغیر آستینوں کی قمیصیں پہنی جا رہی ہیں اور ساڑی کے بلاؤز بھی۔"

قمر غصہ بھول کر سناٹے میں آ گئی۔ ایک قمیص کی آستینیں اس نے بھی اڑا دی تھیں۔ اچھی طرح چھپا کر رکھنا ہوگا۔ یہاں پہننے کا تو

PDF Compressor Free Version

سوال نہیں، لیکن بھنک نہ لگے کہ الٰہ آباد میں پہن رہی ہے۔ کانووکیشن کے موقعے پر ایک سہیلی سے مانگ کر لپ اسٹک لگائی تھی اور اماں کے سامنے اس کا ذکر کر دیا تھا کہ سہیلیوں نے کہا، قمر لپ اسٹک لگا کے بہت اچھی لگ رہی ہے، تو اماں ہول گئیں کہ کنواری لڑکی اور لڑکوں کے بیچ میں ہونٹوں میں لالی لگا کے گھومی!

ہم نہ جانے کتنی باتوں سے نظریں چراتے رہے۔ لڑکیوں نے جینز پہننا شروع کی۔ انگریزی اسکولوں میں ویسے بھی یونیفارم اسکرٹ بلاؤز ہی تھی۔ پلس ٹو تک اٹھارہ برس کی لڑکیاں اسکرٹ بلاؤز پہن کر جاتی رہیں۔ لڑکیاں لڑکوں سے گھل مل کر بات کرتی تھیں، لیکن ہم نے ہائے ہائے نہیں مچائی۔ اب تو لڑکے لڑکی کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ ایک ہم تھے بغل میں لڑکا آ کے بیٹھ گیا تو جلدی سے سمٹ گئے۔ معلوم ہو کہ کھا ہی تو جائے گا۔ اب لونڈوں سے ابے تبے کر کے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم سمجھتے تھے، اماں کم پڑھی لکھی ہیں، ہم پڑھ لکھ گئے ہیں، انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے پرابلم ہو جاتا ہے، مگر ہمارے لئے جو چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں وہ اماں کے لئے بڑی تھیں اور جو باتیں آج ہمیں بڑی لگ رہی ہیں وہ ہماری بیٹیوں کے لئے چھوٹی ہیں۔

رضوانہ کہتی ہے: ''دلی اور لکھنؤ میں فاصلہ ہے ہی کتنا اور ممی، ہم دو لڑکیوں کے ساتھ فلیٹ لے کے رہ رہے ہیں۔ ذرا پیسے آ جائیں، پھر موبائل لے لیں گے، جب چاہنا بات کر لینا۔ اتنا ہولتی کیوں ہو؟''

''ہولیں کیوں نہیں؟ دلی، پھر وہی big bad metro ،

رضوانہ کے فائنل امتحان ختم ہونے اور بمبئی جا کر ملازمت جوائن کرنے کے درمیان کوئی پندرہ بیس دن کا وقفہ تھا۔ لڑکی اس وقفہ میں گھر آ رہی تھی۔ ایک آخری کوشش کر لی جائے گی۔ ارے بھائی، وکالت پڑھ لی، اب کچھ دن گھر میں رہ لو۔ یہیں پریکٹس کر لینا۔ کسی وکیل سے اٹیچ ہو جانا۔ گرچہ یہ وکالت کی پریکٹس نہایت گڑبڑ معاملہ تھا، پھر بھی بمبئی جا کر اکیلے رہ کر کسی لا فرم میں نوکری کرنے کے مقابلے میں تو بہت بہتر تھا۔

چائے کی پیالی قمر کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔ کیا رضوانہ سنے گی؟ کیا اپنے کریئر کے مقابلے میں والدین کے جذبات اور ایک ایسا مستقبل جس میں شادی از حد ضرور ہو، اسے منظور ہوگا؟

ماں کی طویل گفتگو رضوانہ نے خاموشی اور صبر کے ساتھ سنی، اتنے صبر سے کہ قمر کو حیرت ہونے لگی کہ یہ وہی رضوانہ ہے؟ ذرا خیال آیا کہ اس کی طبیعت تو خراب نہیں؟ شاید سست ہو رہی ہے۔ وہ نہ کسی دلیل پر جھنجھلائی، نہ جواب دیا۔ اطمینان سے ناخن گھس کر، ہاتھ پھیلا کر مخروطی نازک انگلیاں تکتی رہی۔ جب قمر خاموش ہو گئی تو اس نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا:

''مما تمہاری یہ اس ریکارڈ پر اٹکی سوئی جگہ سے کبھی ہٹے گی یا نہیں؟'' اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد باہر نکل کر اس نے اعلان کیا:

''ہم جا رہے ہیں میرا سے ملنے۔ دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھائیں گے، مگر شام کے لئے کچھ انتظام کر کے مت رکھنا، آج پورا ڈنر ہم بنائیں گے۔ آج تم آرام کر لو۔ خدا حافظ۔'' اس نے ماں کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا، پرس جھلاتی باہر نکل گئی۔

میرا انتظار ہی کر رہی تھی، دوڑ کر لپٹ گئی۔ اچانک رضوانہ بڑے زور سے چونکی۔

''اری میرا، تیرا تو ساتواں آٹھواں مہینہ ختم ہونے پر ہونا چاہئے تھا۔ کیا ہوا؟ یہ..... یہ.....'' اس نے بڑی پریشانی کے ساتھ میرا کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''صبر، رضوانہ، ذرا صبر!'' میرا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''سب خیریت ہے۔ ذرا دم لے لے اور بیٹھ۔''

رضوانہ بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ متردد تھا۔ ''تین مہینے ہوئے کہ میں نے ایم ٹی پی کرا دی۔ چوتھا مہینہ تھا۔''

''ایم ٹی پی کرا دی، کیا مطلب؟'' رضوانہ نے مزید پریشان ہو کر پوچھا۔

''الٹرا ساؤنڈ کرایا تھا۔ بیٹی تھی۔''

''تیرا دماغ خراب ہو گیا تھا کیا ری میرا؟'' رضوانہ سکتے کی کیفیت میں تھی۔

''ساس اور شوہر دونوں کا دباؤ تھا۔''

''اور تو دباؤ میں آ گئی؟ پڑھ لکھ کر گدھے پر لاد دیا؟''

PDF Compressor Free Version

رضوانہ بے حد خفا تھی۔ ''تجھ سے اچھی تو میری مما ہیں۔ ایک جنریشن پہلے انہوں نے دو بیٹیاں پیدا کر کے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے، بیٹیاں سہی، لیکن اب اور نہیں۔ تو بھی تو یہ کر سکتی تھی یا زیادہ سے زیادہ ایک تیسری بار ٹرائی کر لیتی۔''

''شاید قمر چاچی پر اتنا دباؤ نہیں پڑا تھا۔ تمہارے پاپا کا کوئی بزنس ایمپائر بھی نہیں تھا جس کے لئے لڑکے کی چاہ حد پار کرتی اور پھر ہمارے یہاں یہ لکھا اگنی والا چکر بھی تو ہے۔ منھ میں آگ نہیں دی تو موکش نہیں ملے گا۔''

''اور اگلی بار بھی کوکھ میں بیٹی آئی تو؟''

''دیکھتی ہوں، کتنی بار اور ابارشن کرائیں گے۔ ایک بار کے لئے اور رضامند ہو جاؤں گی اور وہ آخری بار ہوگا۔ پھر بھی بیٹی ہو تو ہو۔''

''ایک بار اور؟ میرا، تیری تو امیج خراب ہو رہی ہے۔ میں تو تجھے بڑا آئیڈیل مانتی تھی۔''

میرا ہنسی۔ ''اس 'اہروا' کے fiasco کے بعد بھی؟''

''وہ بات اور تھی۔ تو نے خود ہی سمجھ لیا تھا کہ اس اہروا کے ساتھ تیرا کوئی فیوچر نہیں ہے، پھر گھر والوں کو کیوں ناراض کیا جائے۔ گھوم پھر کے، تفریح کر کے واپس آ گئی تھی کھونٹ پر۔ سچ میرا، اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔''

ایک زمانہ تھا، میرا کو چار گھر آگے والے پڑوسی کا بیٹا بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ رہی پڑوسی کے بیٹے کی بات، تو وہ تو یہاں تک کہہ رہا تھا کہ میرا تیار ہو تو وہ خاموشی سے نکال لے جائے گا، پھر شادی کر کے آ کے بڑوں کے پیر چھو لیں گے، لیکن میرا کو معلوم تھا، لڑکا یادو تھا، ان کے گھر میں اماں کے حساب سے کوئی بھی بات گڑ بڑ ہوتی تو اماں پھٹ سے کہتی تھیں۔

''ہیں نا اہیر، بھینس چرانے والے! تمیز کہاں سے آئے گی؟ افسر بن گئے تو کیا اور دے گورنمنٹ ریزرویشن۔ نااہل آن آن کے کرسی پہ بیٹھ رہے ہیں۔'' اور تو اور، ایک بار ٹرین بہت لیٹ ہو گئی تو اماں نے کہا کہ:

''یہ کم ذات نیچ ذات بڑے عہدوں پر چڑھے بیٹھے ہیں، ہر محکمے کا بھٹہ نہ بیٹھے تو کیا ہو۔ کوئی کھٹک، کوئی اہیر ریل ہانک رہا ہوگا۔

اب چلا رہا ہے اسے بھینسا گاڑی کی طرح۔''

میرا ناراض ہونے کے باوجود ہنسی کے مارے لوٹ گئی تھی۔ تصور کیا کہ ریل کے آگے بھینس جتی ہوئی ہے۔ ارے، یہاں تو ملک کے آگے ہی بھینس جتی ہوئی ہے۔ چل رہا ہے بچر بچر۔

ان دنوں رضوانہ بڑی پریشان رہا کرتی تھی۔ جانے میرا پہ کیا ری ایکشن ہو، لیکن میرا بہت جلد ہی سنبھل گئی تھی۔ کچھ گھر والوں کو بھی سمجھ میں آ رہا تھا، اس لئے اتنی تندہی سے رشتہ لانے میں جٹے اور یوں پھٹ سے شادی طے کی کہ گریجویشن تک پورا نہیں ہونے دیا۔ میرا کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا، پھر خوش بھی رہی۔ شوہر اچھا ملا تھا۔ گھر والے بھی ٹھیک تھے، لیکن ابھی جو حال میں میرا نے خط میں لکھا تھا کہ اپنی ہم نام میرا کو جانتی ہوں جو کہہ گئی تھی۔ جو میں ایسا جانتی......تو رضوانہ کو کہیں کچھ کھٹکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔

''میرا، سچ بتانا، کیا تو سیریس تھی؟''

''پرانی بات ہو گئی، چھوڑ اسے۔ وہ بتا، وہ میرا جات بھائی، وہ کہاں تک پہونچا؟'' میرا نے بات پلٹ دی۔

''مائی فٹ، میرا! اب تو بھی؟'' پھر وہ یکلخت خاموش ہو گئی۔ اسے ایک بار رنجنا سریواستو نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کے حلقے میں ایک بڑا اسمارٹ سا مسلمان لڑکا تھا، سلمان قریشی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''یار مجھے رضوانہ بہت پسند ہے، لیکن کیا کروں۔ She is "Sameer's gal"'' رضوانہ بہت خفا ہوئی۔

پھر دو ایک بار وہ سمیر کے گھر جا نکلی تھی تو اس کی ممی ملیں تو خندہ پیشانی سے، لیکن بیٹے سے بولیں:

''ذرا سنبھل کے چلنا۔ لڑکی مسلمان ہے، گھر تک چلی آ رہی ہے۔ ہمیں تو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''کیوں اماں، آئی ایس آئی کی ایجنٹ لگ رہی ہے جو گھبراہٹ ہو رہی ہے؟''

''اوندھی کھوپڑی تیری! ارے بات آگے مت بڑھا۔ رشتہ توڑ دو تو دکھ ہووے، جوڑ دو تو جگ ہنسائی۔''

''اس رشتے سے آگے کچھ سوچتا ہے اماں؟ ایک رشتہ دوستی کا

PDF Compressor Free Version

بھی تو ہوتا ہے۔"

"لڑکے لڑکی میں کوئی دوستی نہیں ہوتی۔ سلام دعا سے آگے ہو رہا ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو بھگوان نے گڑھا ہے۔ استری پرش کا رشتہ۔ ہم کوئی جاہل جھیٹ نہیں ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔"

"پڑھ لکھ کے گدھے پہ لادو دیا۔" سمیر منہ ہی منہ میں بھنبھنایا اور آگے پورے ڈائیلاگ رضوانہ کو سنائے۔ خوب ہی تو ہنسا۔ پھر چڑانے کے لئے بولا:

"تو رجوانہ ڈارلنگ آگے کیوں نہ وہی رشتہ ہو جائے جو بھگوان نے گڑھا ہے، استری پرش کا رشتہ؟" (سمیر کی ماں رضوانہ کو رجوانہ کہتی تھیں۔)

"چپ کیوں ہوگئی؟" میرا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، سوچ رہی تھی کہ سمیر کی ماں میں اور تجھ میں کیا فرق ہے؟ مردوں اور عورتوں کے درمیان افلاطونی دوستی کا تصور ابھی تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکا ہے۔" اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

"پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی نہیں؟" میرا مسکرائی۔

"میری ایک بنگلہ دیشی فرینڈ ہے....."

رضوانہ نے بات کاٹ دی۔ "ایک ہی گھر میں لوگ رہ رہے ہوں اور دیواریں اٹھا کر آنگن بانٹ دو تو لوگ بدل جائیں گے کیا؟ سارا کچھ تو ایک ہی ہے۔ جب بات کرو اس میں پاکستان گھسا دے گی، بنگلہ دیش کو لے آئے گی۔ بجرنگی ہوگئی ہے کیا؟ یا درگا واہنی میں شامل ہوگئی ہے؟" رضوانہ اور زیادہ خفا ہوئی۔

'بجرنگی' پر میرا زور سے ہنسی۔ "کیا اب ہم پالیٹکس ڈسکس کریں گے؟"

"بالکل نہیں کریں گے، اس لئے کہ ہم اتنے دن بعد اس کے لئے نہیں ملے ہیں، لیکن میرا، اس بار میں نے پاکٹ منی سے بچا بچا کے دو کھلونے خریدے تھے۔ میرا بیگ دیکھ۔ ایک تیری بٹیا کے لئے اور دوسرا ہونے والے بچے کے لئے۔ تیرا پیٹ دیکھ کر تو میں سناٹے میں آگئی۔ تو نے اس کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ سچ بتانا میرا، کوئی guilt feeling نہیں ہوئی؟ صدمہ نہیں ہوا؟"

"رضوانہ، زخم مت کریدو۔ ہم نے کچھ سوچ کر جیسے نیرج یادو کو چھوڑا تھا، اسی طرح اس بچے کو بھی، اور بچہ کہنا نہیں چاہئے۔ وہ صرف ایک foetus تھا۔" پھر قدرے توقف کے بعد بولی:

"تجھ سے تو بہت پرانا رشتہ ہے۔ تیری نانیہال میں ہی تو ممی کے چاچا تھے جن کے یہاں چوتھی بیٹی ہوئی تو دادی نے شروع ہی سے دھمکی دینی شروع کی تھی کہ اگلی بار بیٹی ہوئی تو وہ چاچا کی دوسری شادی کرائیں گی، لیکن چلو، ماما ہو گئے، دو نئے ماما۔ چھٹی اولاد پھر بیٹی ہی ہوئی۔ دادی کا اصرار تھا کہ کم از کم دو بیٹے ضرور ہوں۔ خیر چلو، ایک تو آ گیا تھا منہ میں آگ لگانے والا، اس لئے ممی کی چاچی بچ گئیں۔ اب میں تو پانچ اور چھ کی لائن لگانے سے رہی۔"

رضوانہ ہنسی: "ممی جب میکے کے قصے سناتی ہیں تو اس میں دو بہت دلچسپ کردار ہوتے ہیں؛ ایک پگلی جمادارن اور ایک امیرن خالہ۔ کہاں کے لوگ کہاں مل جاتے ہیں! تیری ممی کی چاچی کو مما شکلائن چاچی کہا کرتی تھیں۔ ان کی چوتھی بٹیا پر پگلی جمادارن نے بڑے تاسف کا اظہار کیا تھا۔"

میرا بھی ہنسی۔ "چوتھی بیٹی پیدا کرنے والی عورت ہے ہی اس لائق کہ مہترانی بھی اس پر ترس کھائے۔ 72 میں ابارشن کو قانونی اس لئے بھی بنایا گیا کہ لوگ لڑکے کی چاہ میں لڑکیوں کی لائن لگاتے چلے جاتے ہیں۔"

"اور ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں!" رضوانہ نے لقمہ دیا۔

"مگر ہم جی رہے ہیں اٹھارہویں صدی میں۔ اسے نہ تم بدل سکتی ہو نہ میں۔"

"میں تو بدل لوں گی۔ تو شاید ڈرپوک ہے۔ تیری بیٹی بدلے گی۔" رضوانہ کے لہجے میں سرزنش تھی۔

میرا زور سے ہنسی۔ "تیری برادری تو اور بیک ورڈ ہے۔ ایک تو ہی bond بنی پھر رہی ہے۔ ہاں، ابھی تیرے یہاں دلہنیں جلائی نہیں جا رہی ہیں اور ذات کو لے کے بھی اتنا رولا نہیں مچتا۔"

"ہاں، دلہنیں جلائی نہیں جاتیں، یک طرفہ طلاق دے کر

PDF Compressor Free Version

گھر بھیج دی جاتی ہیں کھڑے گھاٹ۔ تین طلاق کو لے کے تم جتنی نکتہ چینی کرلو، لیکن یہ فائدہ ضرور ہے کہ جان بخش دی جاتی ہے۔ اب اگر کسی لائق ہو تو کھا کما لو۔ زیادہ خوش قسمت ہو تو دوسرا بھی شاید مل جائے ورنہ اماں ابا پر بوجھ بنو، بھائی بھاوج کی چاکری کرو، جوتیاں بھی کھاؤ۔ رہی ذات، تو اشرافیہ کی چار ذاتوں سید، شیخ، مغل، پٹھان پر اتنا زور لانہیں مچتا۔ سید کی بیٹی جلاہا گھر لا کے دیکھے تو سہی!"

"پھر بھی ذات کو لے کر honour killing نہیں ہے۔ جلا کر مار دینے سے تو یہ option بہتر لگتا ہے۔ عورت جاہل ہوئی تو جھاڑو برتن کرے گی۔ مری نہیں تو کسی طرح جی لے گی۔ زندگی ہر حال میں موت سے اچھی لگتی ہے۔"

"لوگ خودکشی بھی تو کرتے ہیں۔"

"کٹھ حجت وکیلنی! خوب اچھی طرح جانتی ہے کہ ویسا extreme حالات میں کبھی کبھی ہی ہوتا ہے، اور یہ لوگ نارمل نہیں رہ جاتے جو اپنی جان لے لیتے ہیں، سمیر خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے کیا؟" اس نے خفا ہو کر کہا۔

رضوانہ قہقہہ مار کے ہنسی: "مما جاننا چاہ رہی تھیں کہ وہ مسلمان ہے کہ ہندو۔ ہم صفا ٹال گئے، اس لئے نہیں کہ ہندو کہنے پر ہمیں کوئی جھجک تھی، مگر مما کا suspense قائم رکھنے میں بڑا مزہ آرہا ہے۔"

"رہی بدتمیز کی بدتمیز! بیچاری قمر چاچی۔"

"ارے ہم تو بہت شریف ہیں۔ بالکل مما، بلکہ نانی کی جنریشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصل تو وہ عمرانہ بم پھوڑنے والی ہے۔ وہ انوراگ کا معاملہ ذرا سیریس ہوتا جارہا ہے۔"

میرا کھانا لگوانے کے لئے اٹھنے لگی تھی۔ اس نے چلتے چلتے ذرا زور سے کہا: "ہمیں بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ جب پچھلی بار عمو سے ملے تھے تو اس کے پاس انوراگ کے علاوہ کوئی ٹاپک ہی نہیں تھا۔ عزیز کے یہاں سے مٹن دوپیازہ منگوالیا ہے اور مٹر پلاؤ خود بنایا ہے۔ چلے گا؟"

"دوڑے گا، دوڑے گا۔"

میرا کھانے کی بہت شوقین تھی۔ اس کے اپنے گھر میں سب لوگ سبزی خور تھے، لیکن سسرال میں مرد گوشت کھاتے تھے۔ شادی سے پہلے میرا چکھ چکی تھی، لیکن گھر میں کسی سے بتایا نہیں تھا۔ وہ جب بھی قمر چاچی کے یہاں آتی اور بریانی پکی ہوتی تو گوشت کی بوٹیاں ہٹا کر چاول لے کر کھایا کرتی تھی، پھر ایک دن دھیرے سے اس نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا مٹن کا بھی لیا۔ بھر پیٹ بریانی کھا کر بولی: "چاچی، پتا نہیں یہ vegetarianism کہاں سے آگیا۔ اب دیکھو نا، اتنی مزیدار چیز سے اتنے لوگ محروم ہیں۔ ہماری اماں تو پریشان رہتی ہیں کہ ہم آپ کے یہاں ہر وقت بیٹھے رہتے ہیں، ضرور گوشت کھا کے آئیں گے۔ آریہ تو گوشت کھایا کرتے تھے۔"

"آریہ تو پتا نہیں کیا کیا کھاتے تھے، لیکن تو تو چپ ہی رہ!" قمر ہنس پڑی۔

"ہمارا مطلب یہ چاچی کہ یہ ساری food habits ہیں، ان کا دھرم سے کیا لینا دینا ہے؟ اگر ہے تو انسانوں نے ہی جوڑا ہے۔"

"تجھے گوشت کھانا ہے تو کھا، بکرے کیوں گن رہی ہے؟"

رضوانہ گرمی کی چھٹی میں گھر آئی ہوئی تھی۔ میرا کی شادی طے ہو چکی تھی۔ وہ دونوں کافی وقت ساتھ گزار رہی تھیں، گھوم گھوم کر خریداری کر رہی تھیں۔

"چاچی، اماں کے سامنے بول مت دیجئے گا کہ ہم یہاں آ کے بریانی اڑاتے ہیں۔"

دراصل دوستی لڑکیوں میں ہی زیادہ تھی۔ قمر کا ننہال اور میرا کی ماں کا دادیہال ایک ہی شہر میں تھا۔ شکلائن کو اماں جانتی تھیں، ابو اور شکلا جی میں جان پہچان تھی، لیکن خواتین میں آنا جانا بہت کم تھا۔ اب یہاں لکھنؤ میں لڑکیوں میں اتنی دانت کاٹی دوستی ہو گئی تھی۔ میرا کی شادی بہت جلدی طے کر دی گئی تھی۔ ویسے قمر کا خیال تھا کہ اچھا ہی ہے۔ رضوانہ کی وجہ سے وہ پریشان رہ رہی تھی۔ اسے بھی ناتھ دیا جاتا تو اچھا تھا۔

"ایک تو تمہاری اماں سے ملاقات ہی چھٹے چھ ماہے ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی چوری میں وہ لوگ شریک ہوں تو دونوں ڈرے رہتے ہیں، کون کس کا راز کھولے گا۔"

"آپ چور کہاں سے ہو گئیں؟" میرا قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

PDF Compressor Free Version

''کیوں، ہمارے اوپر تمہارا دھرم بھرشٹ کرنے کا الزام نہیں لگے گا؟''

''ہم نے آپ کی پتیلی سے چرا کر بریانی کھائی۔ آپ تو منع کرتی ہی تھیں۔'' وہ پھر ہنسی۔

میرا کا مزاج ہی ایسا تھا۔ قمر اسے 'قلقل مینا' کہا کرتی تھی۔ ہنستی ہے تو لگتا ہے چاندی کی تھالی پر چاندی کے کنچے لڑھک رہے ہوں۔ صبح صبح گومتی کے کنارے ہنومان مندر میں پوجا آرتی ہوتی ہے اور دور سے گھنٹوں کی آواز آتی ہے تو لگتا ہے، میرا ہنس رہی ہے۔

''قمر چاچی!''

''ہاں، بولو بٹیا۔'' قمر کے لہجے میں اتنی محبت تھی کہ رضوانہ جل بھن گئی۔

''مما، کبھی ہم سے بھی ایسا میٹھا بول لیا کرو۔''

''تم میرا کی طرح تمیزدار بن جاؤ۔''

''قمر چاچی، ابھی تو ہم قطعی تمیز کی بات نہیں کر رہے۔ ہم آپ کو بتا رہے ہیں کہ ہمیں لفظ چور نہایت فنی (funny) لگتا ہے۔ بلاوجہ ہنسی آتی ہے اور اگر یہ لفظ آپ کے حوالے سے استعمال کریں تب تو ہاہاہا.....'' وہ اتنی زور سے ہنسی کہ انیس کمرے سے باہر آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے، لڑکیو؟'' میرا جلدی سے دبک گئی۔

''نمستے چاچا!''

اس نے چہرہ سنجیدہ بنا لیا اور اٹھ کر انیس کے پیر چھوئے۔

وہ واپس لوٹ گیا۔ تینوں خواتین خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ عمرانہ کے امتحان نہیں ہوئے تھے، وہ کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ چلتے چلتے پلٹ کر بولا: ''ذرا دھیرے سے ہنسو، عمو پڑھ رہی ہے۔''

میرا نے ہونٹ کاٹے، پھر دھیرے سے بولی: ''چاچی، ہم بڑے خوش قسمت ہیں۔''

''کیوں؟'' رضوانہ نے تیوریاں چڑھائیں۔ ''بی اے کرتے سے اٹھا کر شادی کر دی جا رہی ہے، اور یہ خوش قسمت ہیں!''

''بی اے تو ہم کر ہی لیں گے۔ ایم اے بھی کریں گے۔ اس کے بعد بھاڑ بھی جھونکیں گے۔ فی الحال خوش قسمت اس لئے کہ ہماری سسرال میں گوشت کھایا جاتا ہے۔ مطلب، مرد کھاتے ہیں۔ پلیٹ میں سے جھوٹن ہمیں بھی مل جایا کرے گی،'' وہ مسرور لہجے میں بولی۔

''ہے ہے بچی! تو جھوٹن کیوں کھائے گی۔ بری باتیں منھ سے نہیں نکالتے'' قمر نے خالص اپنی اماں کے انداز میں کہا۔

''مما، دونٹ بی سلی!'' رضوانہ نے کہا: ''مما سارا مذاق چوپٹ کر دیتی ہیں۔''

''مذاق نہیں۔ سلی تو ہے! ارے، عورتیں گوشت نہیں کھاتیں تو پھر ہم چپکے سے پلیٹ سے اٹھا کر ہی کھا سکیں گے نا؟ ہاں، ساتھ میں چوک جا کے ٹنڈے کے کباب اڑا آئیں یا کسی ہوٹل میں کھا لیں، وہ الگ بات ہے،'' قمر نے کہا۔

''بہت سے گھروں میں عورتیں گوشت نہیں کھاتیں، مرد کھاتے ہیں۔''

''مگر عورتوں کو ان کے لئے بنانا پڑ جاتا ہے۔ ہماری ایک دوست کی چاچی ناک پر کپڑا رکھ کے ڈوئی کے ڈنڈے سے گوشت دھوتی تھیں اور بنا کر رسوئی سے ہٹ جاتی تھیں۔ ان کے ہسبنڈ کو رات کے کھانے میں تو چاہئے ہی چاہئے۔''

''لیکن میری ایک کایستھ دوست کہہ رہی تھیں کہ ان کے خاندان میں سہاگن عورتوں کو تھوڑا سا گوشت ضرور کھانا ہوتا تھا۔ ہفتے میں کوئی دو دن،'' قمر نے کہا۔

''سہاگن کو کیوں؟'' بیوہ کو کیوں نہیں؟ اور کنواری کو؟''

''کنواری کو بھی نہیں۔'' قمر ہنسی

''مگر کیوں؟'' رضوانہ جھنجھلائی۔

''میری مت ماری گئی جو میں تم لڑکیوں کے سامنے یہ بات لے بیٹھی۔ بات میں بات نکل گئی تم کٹھ حجتوں کے سامنے۔ ضروری نہیں ہر بات تم جانو۔''

''چل رضوانہ، میرے لئے چکن کی ساڑیاں لینی ہیں۔ چوک چلتے ہیں۔'' میرا نے بات ختم کرتے ہوئے پرس ٹٹولا۔ ''ہاں، پیسے رکھ لئے ہیں۔''

دونوں خوش و خرم لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرا کے بال

PDF Compressor Free Version

بہت گھنے اور لانبے تھے۔ اٹھتے ہوئے اس نے گھنی لانبی چوٹی پیچھے پھینکی تو اس کا دلکش مسرور چہرہ قمر کے دل پر نقش ہو گیا۔ اللہ سب کی بیٹیوں کو خوش رکھے۔ کیسی معصوم بچی ہے اور اللہ میری بیٹیوں کے لئے بھی جلد ہی ایسے لڑکے مہیا کر دے کہ ہم خوشی خوشی ان کا بیاہ کریں۔

میرا کے گھر والے خاصے پیسے والے تھے۔ پہلی بیٹی کی شادی کر رہے تھے، اس لئے حیثیت سے بھی بڑھ کر خرچ کر رہے تھے۔ ان دنوں لڑکیوں میں ایک فیشن چل نکلا تھا کہ زیور نہیں پہنیں گی، ناک نہیں چھدوائیں گی۔ سیندور ڈالیں گی تو چھپا کر، مانگ کے اندر ایک ننھی سی بندی، لیکن میرا آج کے فیشن میں نہیں بہی تھی۔ اسے یہ سب بہت پسند تھا۔ ''شادی کے بعد تو ہم چھمک چھلو بن کر رہیں گے۔'' وہ زیور ٹرائی کر رہی ہوتی تو کانوں کے جھومک ہلاتی، ہاتھوں میں سونے کے کنگن بجاتی۔ تھرک تھرک کے سب دکھاتی اور پوچھتی: ''یہ کیسا لگ رہا ہے؟'' ساڑی کے پلو کو سر پر لیتی۔ کبھی کبھی گھونگھٹ بھی نکال لیتی۔ وہیں دکان میں ہی ساری نوٹنکی ہو جاتی۔ عمرانہ کو جب موقع ملتا تھا، وہ بھی ساتھ لگ لیتی تھی۔ میرا کا گھونگھٹ اور آگے کھینچ کر بہت بوڑھی آواز بنا کر کہتی: ''ذرا ٹھیک سے پردہ کرو بہو، سامنے سسر بیٹھے ہیں۔ اماں نے کیا سکھا کے بھیجا ہے؟'' سامنے سسر بیٹھے ہیں، کہتے ہوئے ایک بار تو اس نے کہنی مار کر للولال بمل کشور کی مشہور دکان میں گدی پر بیٹھے ہوئے تھلتھلے سیٹھ جی کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ میرا ہنستے ہنستے وہیں لوٹ گئی۔ ساتھ بیٹھی خریدار عورتیں پلٹ پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔

للولال بمل کشور والوں نے میرا کا شادی کا لہنگا، راجستھان سے گوٹے کا کام کرا کے منگایا۔ میرا نے ڈیزائن خود تیار کر کے اس کا اسکیچ ان لوگوں کو دیا تھا۔ جب جوڑا بن کے آیا تو فوراً ہی پہن کے بیٹھ گئی، پھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہن کے، کندن کا ٹیکہ لگا کے کمرے سے نکلی تو ماں نے ایک دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر مارا اور دوسرا اپنے ماتھے پر۔ ''اری بے شرم، شادی سے پہلے جوڑا چڑھا لیا۔ اپ شگن ہوتا ہے۔''

میرا نے دو ہتڑ کی قطعی پرواہ نہ کی، حالانکہ لگا زور سے تھا۔ ''ارے ممی، ہم ٹرائل لے رہے تھے اور دیکھ رہے تھے، دلہن بن کے کیسے چھنڈخ لگیں گے۔ ممی، ایسا مردانہ ہاتھ ہے تمہارا! اچھا مار لو، مار لو، پھر ہم نندرانی مشرا کی بہو بن جائیں گے، تب مار کے دیکھنا۔ بڑی دبنگ ساس ہے ہماری۔''

شبھ شبھ بول! یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ نندرانی مشرا بڑی دبنگ ہیں؟''

''ارے ہمیں سب خبر ہے۔ پوری ریسرچ کر لی ہے ہم نے۔ بڑی بہو کو تو جلانے کی کوشش بھی کر چکی ہیں۔''

''ہے ہے لڑکی، بھگوان سے ڈر! سچ ہے، کلجگ آ گیا ہے۔ پہلے ساسیں بہوؤں پر دوش لگاتی تھیں، اب بہوئیں.....'' لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت میرا کی ممی دل ہی دل میں ڈر گئی تھیں۔ کہاں سے ایسا سن لیا لڑکی نے؟ ذرا پتا لگائیں، لیکن ساری ریت رسمیں پوری کر کے سگائی تک ہو چکی تھی۔ انہوں نے ٹوہ لینی شروع کی۔ سگائی ہی تو ہوئی ہے۔ اگر خاندان میں ایسی کوئی افواہ بھی ہے تو میرا کے پاپا سے کہنا ہوگا۔ میرا دل ہی دل میں ہنس ہنس کر لوٹیں لگاتی رہی۔

رکھب داس کے یہاں کندن کا پورا سیٹ آرڈر کر دیا گیا۔ کندن کے زیور میرا کو بہت پسند تھے۔ اس کی نانی نے اس کے لئے کشمیر سے شاہ توش کی شالیں منگوائیں۔ چاندی کا ڈنر سیٹ دیا گیا۔

رضوانہ کے گھر سے شادی میں سب لوگ شریک ہوئے۔

''ارے دلہن بی بی، ذرا شرم کر لو!'' میرا کے زیادہ چھم چھم کرنے پر رضوانہ نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں نکال کر اسے کہنی ماری تھی۔

''جل مت!'' اس نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا: ''تیری شادی جلدی ہی کرائیں گے۔'' پاس کھڑا دولہا بھی ہنس پڑا۔ میرا کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ اکلوتی لڑکی تھی۔ دولہا نے خوش دلی سے رضوانہ اور عمرانہ کو سالیاں تسلیم کر لیا۔ میرا کی ممی نے جوتا چرائی کی رقم میں میرا کی چاچا ماما کی لڑکیوں کے ساتھ ان دونوں بہنوں کا برابر کا حصہ لگایا۔

رخصت ہوتے وقت میرا نے گھونگھٹ ذرا لمبا کھینچ لیا تھا اور قدرے جھکے شانوں کے ساتھ اس کے اندر منہ چھپا کے یوں کھی کھی کھی کرتی ہل رہی تھی کہ لوگ سمجھے وہ رو رہی ہے۔ صرف رضوانہ کو بقول خود اس کے ''یہ کمینہ پن'' معلوم تھا۔ بعد میں اس نے کہا تھا: ''ارے کون سی رخصتی، کہاں کی رخصتی! ڈالی گنج سے اٹھ کے ڈالی باغ

PDF Compressor Free Version

چلے آئے۔ سسرال والے بھی ڈر کے رہیں گے۔ بہو کو مائیکے بھاگنے میں پل بھر بھی نہ لگے گا۔ یہ بھی نہیں کہ اسٹیشن سے پکڑ کے واپس لے آئے۔ رونے کی بات ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اور سن رضوانہ، جل مت جائیو۔ ہمارے سسرال والوں نے یا قوت کا سیٹ چڑھایا ہے۔''

''جلے ہماری جوتی!'' رضوانہ چڑ گئی۔

''دیکھا نہیں تھا کیا بری پہ؟''

بچی بہت جلدی ہوگئی تھی، لیکن اس سے پہلے میرا نے بی اے مکمل کرلیا تھا۔ پھر کچھ دن کے لئے اس کی پڑھائی میں بریک لگ گیا تھا، گرچہ سسرال والوں کا کہنا تھا کہ وہ اسے پڑھائی سے روک نہیں رہے ہیں، وہ خود ہی گھر گرہستی اور بچے میں لگ گئی ہے۔ سسر کا بہت بڑا پرنٹنگ پریس تھا۔ اس میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

''اری میرا، تو لکھنؤ جیسے شہر میں ہے، جوائنٹ فیملی میں رہ رہی ہے۔ بچی کو ساس دیکھ لیں گی، آگے کی پڑھائی کرلے۔'' رضوانہ کی دیکھا دیکھی، یا از خود، میرا کو بھی قانون پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔

''ارے تو لا کرلے نا۔ لکھنؤ میں تو ہے ہی۔''

''لا اور میں؟'' وہ زور سے ہنسی تھی۔ ''ابھی میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی Plain Talcs From British Raj۔ اس میں لکھا تھا کہ سولہویں صدی کے وسط میں جب لڑکیاں جہاز میں بھر بھر کر شوہروں کی تلاش میں برٹش انڈیا آیا کرتی تھیں تو انہیں صرف دو باتیں سکھائی جاتی تھی۔ 'چار چھ شام کو پہننے کے اچھے لباس رکھ لینا کہ دلکش نظر آؤ اور زیادہ عقلمند اور تیز طرار بننے کی کوشش مت کرنا، اس لئے کہ مردوں کو زیادہ ذہین اور زیادہ تعلیم یافتہ بیویاں قطعی پسند نہیں ہیں۔' اس ایٹی ٹیوڈ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میرے شوہر اور سسرال والوں کو بی اے سے زیادہ تعلیم یافتہ بہو کی قطعی ضرورت نہیں اور لا! ارے باپ رے.....''

اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

''وہ تو تو ہی کر۔ ابھی اونٹ پہاڑ تلے نہیں آیا ہے۔''

''ارے، تو تجھے میوزک کا اتنا شوق تھا، سیکھ بھی چکی ہے، وہی جوائن کرلے۔ بھات کھنڈے سنگیت ودیالیہ موجود ہے۔''

''اور پھر چوک میں جا کے بیٹھ جاؤں امراؤ جان ادا بن کے؟''

میرا کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔ رضوانہ ہکا بکا رہ گئی۔ میرا منھ پھٹ تھی اور الھڑ بھی، جو منھ میں آئے بکتی رہتی تھی، لیکن یہ ذرا کچھ زیادہ ہوگیا تھا۔

''مر، جو جی چاہے کر۔''

اب رضوانہ نے میرا جیسی پیاری، زندگی سے بھرپور لڑکی اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایک عزیز ترین سہیلی سے سچ مچ تو نہیں کہا تھا کہ مر۔

رضوانہ کو بمبئی کی اس لافرم میں کام کرتے کئی سال ہو چکے تھے۔ لوگوں کے پاس اب موبائل فون آگئے تھے۔ رضوانہ نے نمبر دیکھ کر کہا۔ ''کتنی بار کہا مما سے کہ آفس کے اوقات میں فون نہ کیا کریں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ اب انہیں بھی ایک موبائل لے کر دینا پڑے گا، کہ زیادہ ضرورت ہو تو میسج کردیں۔'' اس نے فون بند کردیا، لیکن دوبارہ رنگ آیا تو اٹھانا ہی پڑا۔ قمر چھکو بھکو رو رہی تھی۔ رضوانہ کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

''کیا بات ہے، مما؟''

''میرا..... میرا نہیں رہی۔''

''کیا؟''

''میرا نہیں رہی، رضوانہ۔''

رضوانہ وہیں دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ فائل اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی جو وہ کھڑی ہو کر پلٹ رہی تھی۔ اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ میرا کی بچی آپریشن سے ہوئی تھی، پھر ایک اسقاط کرایا تھا۔ پھر ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا اور ساری جدید سہولیات کے باوجود کیس بگڑ گیا ہوگا، ورنہ میرا تو بڑی صحت مند لڑکی تھی اور عمر کیا، یہی تیس ایک سال۔

''میرا نے خودکشی کی ہے۔''

قمر نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

رضوانہ دوسرے ہی دن ہوائی جہاز سے لکھنؤ پہنچ گئی۔ دلی سے عمو بھی آگئی تھی۔ لوگ میرا کے پھول چننے گل لالہ گئے ہوئے تھے۔ (لکھنؤ والوں کی ستم ظریفی، شمشان گل لالہ ہے اور قبرستان عیش باغ)

میرا تو بس اتنی ہی پڑھی لکھی تھی کہ شوہر کے منھ کو نہ آسکے، لیکن ساتھ ہی فراٹے سے انگریزی بول کر اس کی عزت افزائی کا سبب بھی بنے۔ وہ بے حد سگھڑ گرہستن تھی گرچہ اس نے کبھی گھر پر کام نہیں کیا

PDF Compressor Free Version

تھا اور انیس برس کی عمر میں کھاتے پیتے گھر کی کون سی لڑکی کام کرتی ہوئی جاتی ہے، لیکن جب وہ بہو اور بیوی بنی تو اسے سال بھر بھی نہ لگا گھر سنبھالنے میں اس نے نوکروں کے باوجود کچن سنبھالنا بھی سیکھ لیا۔ اس کی ساس نے ''نان ویج'' کا چولہا الگ کر دیا تھا۔ وہاں وہ شوہر کے لئے گوشت اور مرغ کے نت نئے پکوان بناتی جن کے لئے اس نے کھانا پکانے کا ایک کورس جوائن کیا تھا، پھر برتن خود مانجھ کر الگ کر دیتی اس لئے کہ اس کی ساس کو اعتراض ہوتا تھا کہ کہارن اُدھر کے برتن مانجھ کر پھر ادھر وہی ہاتھ لگائے گی۔ وہ اتنی کم عمر لڑکی اتنی سمجھدار کہ ساس کے سامنے گوشت نہیں کھاتی تھی۔ چپکے سے شوہر کی پلیٹ سے اٹھا کر کھا لیتی تھی۔

''گوشت پکے تو ٹیبل پر لانے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کمرے میں ہی کھاتے ہیں۔ ہمارے تو چھکے چھٹے۔ ہم خوب اڑاتے ہیں۔ ممی کو ہمارا گوشت کھانا پسند نہیں ہے۔ کہتی ہیں، گوشت کھانے سے لڑکیاں ایگریسیو (aggressive) ہو جاتی ہیں۔'' وہ منہ چھپا کر خوب ہنسی۔ ''خود تو پیاز لہسن تک نہیں کھاتی ہیں، پھر چنڈی کا اوتار کیوں بنی رہتی ہیں۔'' اس نے ٹھی ٹھی ٹھی شروع کی۔

''بند کر یہ پاگلوں والی ہنسی۔'' کہنے کو تو کہہ دیا، لیکن رضوانہ خود اس کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ ''اچھا یہ بتا، پھر تو کھاتی کیسے ہے؟ دوبار کھاتی ہے کیا؟ ساس سسر کے ساتھ ٹیبل پر تو بیٹھنا ہوتا ہوگا؟''

''یہ عام طور سے دیر سے کھاتے ہیں۔ اس سے پہلے تھوڑا ڈرنک بھی کرتے ہیں، اس لئے ہم ٹیبل پر بیٹھ کر تھوڑا سا چکھ کر، کچھ لپاڈگی کر کے اٹھ جاتے ہیں اور بریانی، دو پیازہ دکھائی پڑے تو ہم تو بھرے پیٹ پر کھالیں۔'' وہ پھر ہنسی۔

''اور یہ تو گنوار کی طرح 'ان، انہیں، وہ' کیا کرنے لگی ہے۔ منگنی کے بعد تو سنجے یوں کرتی تھی جیسے سنجے نہ ہوا، چھوٹا بھائی ہوا۔''

''ممی کو ناپسند ہے۔ پہلے ہم نے ان کے سامنے نام لینا بند کیا، لیکن اکیلے میں نام لیتے رہنے سے عادت نہیں چھوٹ رہی تھی، منہ سے نکل ہی جاتا تھا تو ساس سسر، آئے گئے، چاچا چاچی، سب گھورنے لگتے تھے۔ اب بھائی، ہمیں نندرانی مشرا کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ہم نے کہا، چھوڑ بھائی، ٹنٹا ختم۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ رہے گا تو شوہر ہی، نام میں کیا رکھا ہے۔''

اس نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بڑوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھا تھا (یا اس سے رکھوایا گیا تھا۔)

کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

لوگ باگ بہت دن بات کرتے رہے۔ رضوانہ نے چھٹیاں سنبھال کر رکھی تھیں، اس لئے تیرھویں تک رک گئی تھی۔ ایک دن اس کی چھوٹی سی بیٹی کا منہ دیکھ کر اتنا غصہ آیا کہ اس کا جی چاہا، کس کس کے جھانپڑ لگا کے میرا کا بیضوی، گورا چہرہ لال کر دے۔ (پھر اپنے خیال کے انتہائی درجے کے بے تکے پن پر اپنا ہی منہ پیٹ لیا۔) اس بچی کا تو خیال کیا ہوتا۔ بڑھتی عمر والے ماں باپ کا خیال کیا ہوتا۔ خود سارے دکھوں سے بے نیاز ہو گئی، مگر ایسے کون سے دکھ تھے؟ ایسا کون سا پاگل کر دینے والا لمحہ ذہن پر حاوی ہو گیا تھا جو انسان کی بنیادی کمزوری، اس کی زندہ رہنے کی خواہش کو کہنی مار مار کر پیچھے ڈھکیل دے؟

میرا کی ہم عمر کزن نے کئی باتیں بتائیں جو کہیں جگ سا پزل (Jigsaw Puzzle) کے ٹکڑوں کی طرح مل کر ایک تصویر اجاگر کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''ہم سے تو اس نے کبھی کچھ نہیں کہا، جانہوی۔ ہم تو بچپن سے اس کے رازدار رہے تھے۔ ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے تو کچھ کرتے۔ اس نے تو موقع ہی نہیں دیا۔'' رضوانہ رونے لگی تھی۔

''کہا تو ہم سے بھی کچھ نہیں، رضوانہ دیدی۔ ہم بس آتے جاتے، ملتے جلتے، کچھ سمجھ رہے تھے اور کبھی کبھی دو سطروں کے درمیان، دو شبدوں کے پیچھے لکھی لکھائی پڑھنے کی کوشش کر لیتے تھے۔ آپ تو یہاں تھیں نہیں، کبھی کبھی ہی آتی تھیں۔'' اس نے بات جاری رکھی۔

''میرا آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس کی اجازت نہیں ملی۔ کہا، بی اے کرا تو دیا، اب اور کیا کرنا ہے؟ میوزک کلاس کرنی چاہی، وہ منع۔ تھیٹر آرٹس گروپ جوائن کرنا چاہا تو پورا وبال ہی کھڑا ہو گیا۔ کسی زمانے میں اس کے بانی، جب وہ نوجوان تھے، ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ سات سال گھومے، پھر اسے چھوڑ کر ایک خود سے پندرہ

PDF Compressor Free Version

برس چھوٹی، کسی رجواڑے کی لڑکی سے اچانک شادی رچالی۔ اس لڑکی کے دادا بندوق لے کر ان حضرت کا انتظار کرتے تھے کہ دکھائی دیں تو سیدھے شوٹ کر دیں، لیکن پھر لڑکی کے یہاں بیٹا ہو گیا تو معافی تلافی ہو گئی۔ اب یہ بوڑھے ہو گئے تھے، لیکن نندرانی مشرا سمجھتی تھیں کہ تھیٹر آرٹس گروپ لفنگوں کا اڈہ ہے۔''

رضوانہ خاموشی سے سن رہی۔ میرا کی بڑی خوبصورت آواز تھی۔ انٹرمیڈیٹ تک اس نے باقاعدہ میوزک سیکھی بھی تھی۔ گھر کی تقریبوں میں، سہیلیوں کی محفلوں میں وہ خوب گاتی۔

''پھر؟''

''پھر اس نے چار ماہ کا حمل گروایا۔ اس کا اسے بہت رنج تھا۔ آخر دوسرا بچہ ہی تو تھا۔ پھر بھی ہنس کر جھیل لے گئی، لیکن جب دوسرا حمل گروایا گیا، وہ بھی دھوکے سے، جس میں شوہر، ساس، سسر، ڈاکٹر، سب شامل تھے، تو اسے شوہر کے شامل ہونے سے بہت صدمہ پہنچا۔''

''دھوکے سے مطلب؟'' رضوانہ سخت حیران تھی۔

''ایک ٹیسٹ کے بہانے اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا کہ اندر بچے کی گروتھ رک گئی تھی، اس لئے فوری اسقاط ضروری ہو گیا تھا۔ زہر پھیلنے کا ڈر تھا۔ بعد میں تو جرح کرنے سے سب ظاہر ہی ہو گیا۔ میرا نے شوہر کو خوب لتاڑا۔ اس کی بند زبان کھل گئی تھی، ساس کے سامنے چیخنے چلانے لگی تھی۔ یہ سارا کچھ مجھے ٹکڑوں میں معلوم ہوا۔ کچھ یہاں سے، کچھ وہاں سے، آپ کو جس طرح بتا رہی ہوں اس طرح نہیں۔''

''بات زیادہ بگڑتی تو میرا علیحدگی اختیار کر سکتی تھی۔ آخر جان دینے کی کیا تک تھی؟ جانہوی، تو ہی بتا۔'' رضوانہ ہاتھ ملنے لگی تھی۔

''علیحدگی کی تجویز میں نے رکھی تھی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ نجے اب اس پر ہاتھ چھوڑنے لگا ہے، لیکن میرا کے گھر والوں نے اسے فوری طور پر رد کیا۔ دادی نے کہا، لڑکی کو اتنی زبان نہیں چلانی چاہئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا گھر گرہستی اور سہاگ پھونکے گی؟ شاید اسی لئے اس نے خود اپنی جان پھونک کر سب سے انتقام لیا۔''

''لگتا ہے، پہلے کی ساری دادیوں کی تربیت ایک ہی اکیڈمی میں ہوا کرتی تھی۔'' رضوانہ نے زہر خند کے ساتھ کہا: ''ہماری دادی بتاتی ہیں کہ ان کے سسر، یعنی پاپا کے دادا کے ایک طوائف سے مراسم تھے۔ وہ لکھنؤ کی نامی گرامی طوائف بدر منیر تھی۔ پہلا فخر تو اسی بات کا تھا کہ بدر منیر بلانے پر ان کے گھر بھی آجاتی تھی۔ وہ مردان خانے میں بیٹھتی اور دادی اپنے ہاتھ کے مشہور پراٹھے سینک سینک کر شامی کبابوں کے ساتھ قابوں پر قابیں بھجواتی رہتیں۔ پاپا کے دادا کی بیشتر دولت ان ہی بدر منیر اور ان کی بہن پر نچھاور ہوئی۔ حتیٰ کہ کچھ نہ رہا تو بیوی کی پہنچیاں دے آئے۔''

وہ غم و غصے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب کیسا غم اور کیسا غصہ۔ ''میرا..... میرا..... یوں ہارنا چاہئے تھا کیا؟''

جانہوی نے جتنا کچھ بتایا تھا اس کے علاوہ بھی پتا نہیں کیا کیا ہوتا رہا تھا۔ پچھلی بار جب رضوانہ میرا سے ملی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا کہ بار بار خوش مزاجی کا نقاب سرک کر اندر سے ایک اور چہرہ جھانک رہا ہے۔ تب تک وہ سارے ''ایپی سوڈ'' ہو چکے رہے ہوں گے، لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ چلتے وقت بولی تھی۔ ''قمر چاچی اور انیس چاچا کے دباؤ میں آکر بیاہ مت کرنا رضوانہ۔ جب جی چاہے اور جب صحیح آدمی ملے تبھی کرنا اور یہ ضرور بات کر لینا کہ تمہیں کتنی اولادیں پیدا کرنی ہیں اور کب۔''

''ممی کو اب بھیانک خواب آنے لگے ہیں۔ وہ عمو بھی فس سے مس نہیں ہو رہی۔ انگی ہوئی ہے انوراگ پر۔ ممی کو معلوم ہو چکا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاپا کو معلوم ہوا تو ایک اور 'آنر کلنگ' کی خبر میڈیا میں آجائے گی۔ ویسے عمو کو زیادہ فکر نہیں۔ دونوں ساتھ کام کرتے ہیں، شام میں اکٹھی گزارتے ہیں۔''

''ہمارے گھر تو آنر کلنگ کا خطرہ محض ذات الگ ہونے سے ہو گیا تھا، دھرم کی تو بات ہی چھوڑ۔ ماں اور دادی کو بھیانک خواب آنے لگے تھے، اس لئے جلدی سے جولڑکا پکڑ میں آیا اس سے بیاہ دیا۔'' وہ ہنسی۔ ''ویسے دیکھا جائے تو لڑکا دیکھنے میں اچھا، کماؤ، پڑھا لکھا، ذات برادری اونچی۔ اب ہمیں بھی اور کیا چاہئے تھا؟ تو بتا رضوانہ، ایک عورت کو کچھ اور چاہئے کیا؟''

PDF Compressor Free Version

میرا کی ماں نے رضوانہ سے بتایا: ''ہم ایک دن سمدھن جی کے سامنے کہہ بیٹھے 'بھگوان سمجھے اس اہرواسے، نہ وہ زندگی میں آتا نہ ہمیں میرا کی شادی کی اتنی جلدی ہوتی۔ تھوڑا رک گئے ہوتے تو رشتوں کی کیا کمی تھی۔' دراصل اس دوسرے ابارشن کے بعد ہماری ہنستی بولتی بیٹی کو چپ لگ گئی تھی اور وہ کمزور بھی بہت ہوگئی تھی۔ دوائیں، ٹانک، سب اٹھا کے پھینک دیتی۔ نان ویج کھاتی تھی، وہ چھوڑ دیا۔ اس لئے سمدھن جی سے ملاقات ہوئی اور اس کے باوجود انہوں نے میرا کی شکایتیں شروع کیں تو ہمیں آگیا غصہ۔ اسی لئے شاستروں میں غصے کو چار بڑی برائیوں میں گنا گیا ہے۔ آدمی کی مت ماری جاتی ہے۔ ہم جو وہ ازگل بول گئے تو سمدھن جی کے کان تو خرگوش کے کانوں سے بھی لمبے ہوگئے۔ اب لاکھ ہم لیپا پوتی کریں، لیکن انہوں نے جا کے شک کا بیج داماد جی کے دماغ میں بو دیا۔ 'وہ اہیر کون تھا؟ کب تھا؟ اب کہاں ہے؟ اب بھی ملتا ہے کیا؟' دراصل انہیں میرا کے الزام سے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے برہماستر ہاتھ لگ گیا، سراسر ہماری غلطی سے۔ میرا الزام لگاتی تھی کہ اسے دھوکا دے کر چوتھے مہینے کے آخر میں جیتے جاگتے بچے کو مارا گیا۔ وہ ڈاکٹر کا نام سامنے لانے کی دھمکی دینے لگی تھی۔ یوں چپ رہتی تھی، لیکن غصے کا دورہ پڑتا تو..... شاید وہ ہمیں یہ سب بتاتی بھی نہ، لیکن اس دن اس نے اپنا غصہ ہم پر اتارا۔ 'اماں، تمہاری زبان قابو میں کیوں نہیں رہتی؟ اب بتاؤ اپنے داماد اور اس کی چنڈی ماتا کو کہ وہ کون تھا، کب تھا اور کہاں ہے۔ تمہیں کو معلوم ہوگا، ہمیں تو خبر نہیں۔''

''پھر سنا، داماد ہاتھ چھوڑنے لگے تھے۔ ہم تو جانیں، اس لئے کہ اس کی زبان بند رہے۔''

''اور اس نے اپنی زبان ہمیشہ کے لئے بند کرلی! اور چاچی، اس میں اس کے سسرال والوں کا ہی نہیں، آپ سب کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ سب جو پڑھے لکھے ہیں، اعلیٰ خاندان ہیں۔'' لیکن رضوانہ نے بھی اپنی زبان بند ہی رکھی، سوچ کے رہ گئی۔ جو آپ ہی مر رہا ہو اسے مار کے کیا ملے گا۔ میرا نے زندہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوتا تو ان لوگوں سے لڑنے کی سوچی جاسکتی تھی۔ عورتوں کی یہ نسل تعلیم سے بے بہرہ نہیں تھی۔ میرا کی ماں، خود اس کی اپنی ماں، میرا کی ساس اور مرد تو خیر تعلیم یافتہ تھے ہی، لیکن یہ کیسی تعلیم تھی کہ ایک سائنس گریجویٹ نے بیوی کو اس لئے مارا تھا کہ اس نے دوسری بار بھی بیٹی پیدا کی تھی؟ سائنس پڑھ کر بھی اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ بیٹی یا بیٹا مرد کی دین ہوتا ہے؟ یہ مما نے بتایا تھا اور ساتھ ہی جوڑ دیا تھا۔ ''یہ ۴۷ کی بات ہے، اس وقت حمل میں بچے کی جنس پتا کرنا اور اسقاط کرانا عام نہیں ہوا تھا، ورنہ وہ لڑکی یوں مار نہ کھاتی۔ ہاں! بچی جو پیدا ہوئی وہ ماردی گئی ہوتی۔''

نندرانی مشرا کی دلیل اس سلسلے میں کچھ الگ ہی تھی، جو میرا نے پہلے اسقاط کے بعد ہنس ہنس کر رضوانہ کو بتائی تھی۔ ''عورت کے جسم کے اندر جو کیفیت ہوتی ہے وہی یہ تعین کرتی ہے کہ عورت کا بیج مرد کے ایکس کروموسوم قبول کرتا ہے یا وائی، اس لئے عورت ہی ذمہ دار ہے۔''

''یہ آپ نے کہاں پڑھا ممی؟ کس نے بتایا آپ کو؟'' میرا نے ساس سے ملائمیت سے پوچھا تھا۔

''ہم نوٹس نہیں بناتے پھرتے کہ تمہیں ریفرنس دیں۔ تصدیق کرنا چاہتی ہو تو اپنے طور پر ریسرچ کرلو۔'' انہوں نے رکھائی سے جواب دیا تھا اور میرا کو بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتی، کٹ حجت قرار دیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

اور اس کے آفس میں لوگ کم تعلیم یافتہ تھے کیا؟ سب وکیل۔ کئی تو تجربہ کار گھاگ بھی۔ مجرم کو معصوم بنادیں، معصوم کو مجرم۔ جب سے رضوانہ نے عمر کے تیسویں سال کا کیک کاٹا تھا، بیشتر اس کا حوالہ 'اولڈ میڈ' کہہ کر دینے لگے تھے۔ ایک بار کسی نے کمنٹ کیا تھا۔ ''یار کھائی کھیلی لگتی ہیں۔ اب ایسی معصوم بھی نہیں جیسا پوز کرتی ہیں۔''

''کولھے خاصے بھاری ہیں۔ ایسے کولھوں کا مطلب ہے کہ ہر تجربے سے گزر چکی ہیں۔'' جواب ملا۔

ایک شادی شدہ ہمکار نے براہ راست پروپوز کیا تھا۔ پس منظر میں دی جانے والی موسیقی کے طور پر وہ نہایت لطیف پیرائے میں یہ بتاتے چلے آرہے تھے کہ بیوی سے ان کے تعلقات صحیح نہیں ہیں۔ بغیر نام بتائے انہوں نے ہی رضوانہ پر کی جانے والی چھینا کشی کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ کچھ اِدھر اُدھر سے، کچھ بالواسطہ تبصروں سے، اسے خود بھی پتا چلتا رہتا تھا اور وہ چوکھی لڑائی لڑتی رہتی تھی، اسی لطیف پیرائے، اسی

PDF Compressor Free Version

بلاواسطہ اظہار کے ذریعے۔

’’مجھے اپنی زندگی کی راہیں متعین کرنے کا پورا حق ہے۔‘‘

اس نے مضبوطی کے ساتھ اپنے آپ سے کئی بار کہا تھا اور اس پر قائم تھی۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی جب کچھ لوگوں نے یہ اشارہ کیا کہ جس لڑکی کے ساتھ وہ فلیٹ میں رہ رہی ہے اس کے ساتھ اس کے لیزبین تعلقات ہیں۔

’’چھی، گھن آتی ہے ہمیں۔‘‘ رضوانہ نے کہا تھا تو اس کی دوست ہنسی تھی۔

’’اتنی سی بات سے گھن آنے لگی؟ اوکھل میں سر دیا ہے تو موسل کے دھمکے کھانے سیکھو۔‘‘

وہ مزاج میں میرا جیسی لگتی تھی۔ ہنسوڑ، ہر بات کو چٹکیوں میں اڑانے والی، اپنے آپ میں مگن، رضوانہ نے سوچا تھا۔

اس سال لکھنؤ میں ٹھنڈ معمول سے زیادہ پڑی تھی۔ کہرے سے سرشام اندھیرا چھا جاتا۔ کئی دن سے سورج نہیں نکلا تھا۔ میرا کی ماں کے یہاں سے آنے کے بعد رضوانہ کو لگ رہا تھا، ایک ٹھنڈا اندھیرا اس کے وجود میں بھی اتر آیا ہے۔ میرا کی ماں نے جو کچھ کہا تھا، ان ٹھنڈے اداس لمحوں میں رضوانہ نے اسے قمر کے ساتھ بانٹا۔

’’دنیا اب زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہے اور اپنی ساری تعلیم اور ساری تکنیکی ترقی کے باوجود زیادہ سفاک اور بے رحم۔ اب لڑکیاں بول رہی ہیں۔ پہلے بولتی نہیں تھیں۔ کوتوال کے بیٹے سے آنکھ مٹکا ہونے پر جس پہلے لڑکے کے ہاتھ لگنے پر بادشاہ اپنی بیٹی بیاہ دیتا اس کے ساتھ خاموشی سے زندگی گزار دیتیں اور مر کھپ کر جنت پہنچ جایا کرتیں۔‘‘

قمر نے لمبی سانس کھینچ کر لمبی بات کی۔ پھر دونوں ماں بیٹی کچھ عرصے خاموش رہیں۔ انگیٹھی کے کوئلوں پر راکھ کی پرت موٹی ہونے لگی تھی۔ قمر نے اسے لوہے کی تیلی سے کریدا (اسے ہیٹر کی جگہ انگیٹھی جلانا زیادہ اچھا لگتا تھا) اور بات کا سرا دوبارہ پکڑا۔

’’ہم اور تمہارے پاپا، دونوں نے اب تمہاری اور عمرانہ کی زندگی میں دخل دینا بند کر دیا ہے، لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ لوگ ہمیں کیا کیا سناتے ہیں۔ ایک دن ایک ٹیچر نے ہمیں سنا کر اسکول میں کہا ’لڑکیاں پڑھ لکھ کر کمانے لگیں تو ماں باپ بے فکر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ بر بھی خود ہی ڈھونڈ لائیں گی۔‘ اس کالے کوسوں دور بمبئی سے یہاں آ جاؤ تو کم از کم گھر میں آرام اور اطمینان سے رہو گی تو۔ لکھنؤ کوئی دیہات تو نہیں۔‘‘

’’ہاں! اس گھونسلے میں بڑی عافیت ہے۔ ماں باپ ہیں، ان کی شفقت کا تحفظ ہے، لیکن ممی، اس دنیا میں ہم جیسے بھی بہت ہیں۔ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانے والے، اپنی آزادانہ زندگی ایسے اصولوں کے تحت گزارنے والے جن سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔ تم اٹھائیس برس کی ہو گئی تھیں تو نانی نے سوچا تھا کہ تمہاری شادی اب نہ ہو گی۔ پھر ہوئی نا؟ ہم اکتیس برس کے ہو گئے ہیں تو تم بھی اسی طرح سوچ رہی ہو۔ کتنی ترقی ہوئی تمہاری تعلیم کی وجہ سے؟ صرف دو تین سال کی؟ مما، شادی از ناٹ دی اینڈ آف دی ورلڈ، کوئی ایسا مل گیا جس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا دل چاہا تو ضرور کریں گے۔ فی الحال تو پرسوں کی فلائٹ کا ٹکٹ بک ہے۔ واپس جا رہے ہیں۔ ہماری فکر مت کیا کرو، مما......‘‘

اس کی آنکھیں دور خلا میں کچھ دیکھنے لگی تھیں۔ انگیٹھی پر جمی راکھ کی پرت موٹی ہو گئی تھی اور قمر کے دل پر جمی بے چینی کی بھی۔

اس دن پھر قمر نے آفس کے دوران فون کیا۔ گھر پر اس نے رضوانہ کو یقین دلایا تھا کہ اشد ضرورت کے علاوہ وہ کبھی آفس کے اوقات میں فون نہیں کرے گی۔ رضوانہ کا دل طوفان میل کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ کیا ممی، اب کیا سناؤنی سنانے جا رہی ہو۔

’’تجھے کو عدالت نے باعزت بری کر دیا ہے۔‘‘ قمر کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔ ایک اہم فائل سامنے تھی، پھر بھی رضوانہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ فون پر اس کا ہاتھ لرزنے لگا تھا۔

’’میرا کے گھر والوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، لیکن تجھے اور اس کے گھر کے کسی بھی فرد کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ تجھے کو بھری عدالت میں یہ کہنے میں کسی سبکی کا احساس نہیں ہوا کہ......‘‘

PDF Compressor Free Version

قمر کی آواز قدرے لڑکھڑائی ''..... کہ شادی سے پہلے اس کی بیوی کی کسی سے شناسائی تھی اور وہ اس کی وجہ سے شدید ڈپریشن کے عالم میں رہا کرتی تھی۔ دوسرے بچے کے وقت اس نے اسی لئے حمل ساقط کرادیا تھا کہ دو دو بچے اس کے پیروں کی بیڑیاں نہ بن جائیں۔ وہ طلاق لے کر واپس لوٹ جانے کے پھیرے میں تھی۔ اپنے بیان کی تصدیق میں اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے گواہ لاکر کھڑے کر دیے۔ دوسرے اسقاط کے بعد وہ یقیناً ڈپریشن کے عالم میں تھی، لیکن وجہ وہ نہیں تھی جو بیان کی گئی، لیکن ہوا یہ کہ ڈاکٹر کے کچھ نسخے موجود تھے جن میں Antidepressant اور نیند لانے والی دوائیں تجویز کی گئی تھیں۔''

رضوانہ بت بنی سنتی رہی۔ قمر نے اتنا بتا کر فون رکھ دیا۔

''مجھ سے برداشت نہیں ہوا رضوانہ۔ ابھی فوراً تم سے یہ دکھ نہ بانٹتی تو شام ہوتے ہوتے نہ جانے دل کی کیفیت کیا ہو جاتی۔'' میرا سے جو تعلق تھا اس کے علاوہ مجھے تو یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ آج بھی عورتیں کس قدر Vulnerable ہیں۔ تو ایسے عورت موافق قانون بنائے ہیں ہم نے۔

باقی جتنا وقت آفس میں گزرا، رضوانہ کو ہر فائل میں سے میرا جھانکتی نظر آئی۔ ایک ناکام محبت کا درد لے کر بھی انتہائی زندہ دلی کے ساتھ جینے والی لڑکی۔ زندگی میں جو ہاتھ آیا اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنے والی لڑکی۔ کردار کشی لیکن برداشت نہ کر سکی اس لئے کہ جس شخص کا نام لے کر اس پر کیچڑ اچھالی گئی اسے تو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اسے واقعی یہ نہیں معلوم تھا (اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی) کہ اب وہ کہاں تھا، شادی شدہ تھا یا کنوارا۔ اسے یاد کرتا تھا یا ماضی کی غلطی سمجھ کر بھلا چکا تھا۔ دو بیٹیوں کو حمل میں ہی مار دینے کی اذیت کے ساتھ مل کر اس اذیت نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی پاکدامنی پر اچھالی گئی کیچڑ اس کے لئے تیزاب بن گئی۔ میرا، میرا تو..... کتنی بار جنم لے گئی؟ کب تک لیتی رہے گی؟

گھر لوٹ کر اس نے سمیر کو فون کیا۔ ممبئی کے فاصلوں کے حساب سے سمیر بہت قریب رہا کرتا تھا بغیر بتائے تھوڑی دیر میں آ گیا۔

''چلو تمہیں کچھ Comfort Food کھلا کے لاتے ہیں۔ راستے سے اوما کو بھی اٹھالیں گے۔''

''ایسے کہہ رہے ہو جیسے اوما کو اغوا کرنے کا ارادہ ہے۔''

رضوانہ اس اداسی کے باوجود مسکرا پڑی۔ سمیر کی موجودگی بڑے سے بڑے ڈپریشن کو دور کر دیا کرتی تھی۔

''تمہارا دماغ ٹیڑھا ہی چلتا ہے۔ یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ اوما کوئی چیز ہے کیا جسے اٹھا لیا جائے یا یہ کہہ کر لڑ سکتی تھیں کہ تم مرد عورتوں کو چیز بست سمجھتے ہو وغیرہ۔ یہ تمہارے دماغ میں اغوا کا لفظ کیسے آیا، کہاں سے آیا؟''

''لگتا ہے وکیل میں نہیں تم ہو۔''

''جب کچھ نہیں سوجھتا تو تان اسی گھسے پٹے جملے پر ٹوٹتی ہے اچھا یہ بتاؤ یہ تمہاری پٹاخہ روم میٹ کہاں ہے اس وقت۔ اسے بھی لے لیتے۔''

''لڑکیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے واقعی تم سب اوقات پہ آجاتے ہو۔ پٹاخہ، چک، سیکس بم کم از کم تم جیسے مہذب شخص کے منہ سے تو یہ لفظ بالکل اچھے نہیں لگتے۔''

''چلو یہ تو مانا کہ ہم مہذب ہیں، ہم سمیر چترویدی۔ ورنہ ہمارے چاروں ویدوں کے علم کے باوجود تم نے ہمیشہ ہمیں غیر مہذب گردانا۔ ہمیں ہی نہیں ہماری پوری قوم کو۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

رضوانہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ''تم اور تمہارا علم! اجداد کے علم پر کودتے ہو۔ نہ جانے کب کس نے حاصل کیا تھا چار ویدوں کا علم اور چترویدی بن گئیں آنے والی جاہل نسلیں۔''

''ہاہاہا..... آ گئی لڑکی فارم میں چل اٹھ تیار ہو۔'' سمیر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کچھ لیپا پوتی بھی کر لینا۔ صورت پہ بارہ بج رہے ہیں۔''

رضوانہ نے واش روم میں لگے آئینے میں چہرے پر نظر ڈالی۔ واقعی ستا ہوا ہو رہا تھا۔ وہ خوبصورت کسی زاویے سے نہیں تھی بس چہرے پر جاذبیت تھی اور سراپا متناسب تھا۔ ہاں کپڑے سلیقے سے پہنتی تھی۔ حسین لڑکیاں تو ماتمی شکل بنالیں تو بھی حسین لگتی ہیں۔ اوسط صورت ہر منفی جذبے کے ساتھ مسخ ہونے لگتی ہے اور اوسط سے نیچے اتر آتی ہے، لیکن یہ مجھے صورت کا احساس کب سے ہونے لگا؟ وہ چونکی مجھے، حقیقت کی سنگلاخ زمینوں پر چلنے والی لڑکی کو۔

PDF Compressor Free Version

اس نے ہاتھ منھ دھو کر چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیا اور وارڈ روب سے ایک خوبصورت شلوار سوٹ نکالا۔ روزانہ تو کالے سفید کپڑوں میں گزر ہو جاتی تھی۔ شام کو کہیں جانا نہ ہوا تو وہ سیدھے ہاؤس کوٹ پہن کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو جایا کرتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں آئی تو سمیر نے اس پر توصیفی نظریں ڈالیں۔ اسے قدرے حیا کا احساس ہوا اور اس نے سہم کر منھ موڑ لیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے اسے۔

اوما خوشی خوشی ساتھ ہو لی۔ اس کا شوہر سنگاپور گیا ہوا تھا۔ وہ دس منٹ میں تیار ہو کر آ گئی۔ سوچ ہی رہی تھی کہ شام کو کیا کروں۔ بہت بور ہو رہی تھی۔ اس نے مسرور لہجے میں کہا: ''اور اسے کیوں نہیں لے لیا؟ وہ باہر ہے کیا؟''

''کون؟''

''ارے وہی تمہاری چھمک چھلو۔''

سمیر اتنی زور سے ہنسا کہ اسٹرینگ پر اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا بہک گئے۔

''ایسی کون سی بات کہہ دی میں نے؟ اوما ناراض ہو گئی۔

تم عورتیں! بائی گاڈ! میں نے اسے پٹاخہ کہا تھا تو وکیل صاحبہ ناراض ہو گئیں۔ تم نے چھمک چھلو کہا تو کوئی ری ایکشن نہیں ہوا۔ چھمک چھلو، پٹاخہ جیسا گھٹیا نہیں لگتا۔ پھر ہم تو good humour میں کہہ رہے ہیں۔''

''تم جو کہو وہ، good humour، ہم جو کہیں وہ گھٹیا، دراصل تم عورتیں عورتوں کی سب سے بڑی دشمن ہو۔''

''کیوں؟ مرد دشمن نہیں ہیں مردوں کے؟ قتل و غارت گری کون کر رہا ہے؟''

''تم نے تو محاذ کھول رکھا ہے ہمارے خلاف یہ تمہارا فیمنیزم! جھنڈے لے لے کے کھڑی ہو رہی ہو!''

''تم میرا ڈپریشن دور کرنے کو باہر نکلے تھے سمیرا!''

رضوانہ نے ہولے سے کہا۔

''لڑنے سے بھی ڈپریشن دور ہوتا ہے اور کچھ خبثی تمہاری سرشت میں ہے۔ میں تمہارا ڈپریشن ہی تو دور کر رہا ہوں۔ ویسے جو کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔ کچھ بھی گڑھا ہوا نہیں۔''

''اور کیا کیا ہے عورتوں کی سرشت میں؟'' اوما کے لہجے میں شرارت تھی۔ ''سب سے بڑی بات تو یہ کہ سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی ہیں۔ پتھ بھرشٹ کرنے والی اور مسلمان ہو گئیں تو سونے پہ سہاگا۔ دھرم بھی بھرشٹ کرا دیں۔'' سمیر نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں گوتم بدھ بیوی کو چھوڑ کر چل دیے تھے۔''

''اور بھرتری ہری بھی''

اور تلسی داس بھی۔''

''اور حضرت عیسیٰ نے شادی ہی نہیں کی تھی۔''

''اور کبیر نے کی بھی تو کہا کہ عورت ناگن ہے یا باگھن، بلکہ دونوں۔''

دونوں لڑکیوں نے ایک کے بعد ایک نہایت روانی سے کسی واعظ کے انداز میں کہا:

سب حق گو تھے۔ حق گو اور راست باز (سمیر نے میڈیوئیل ہسٹری پڑھنے کے دوران کچھ فارسی پڑھی تھی اور پھر اردو)

''اگر مجھے گاڑی کے ایکسیڈنٹ کا ڈر نہ ہوتا تو تمہاری پیٹھ پر اتنی زور کا گھونسہ مارتی کہ slipped disc کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔''

رضوانہ نے کہا:

''گاڑی سے اتر کر مار لینا۔ میرا تو کچھ نہ بگڑے گا، تمہاری کلائی میں موچ آ سکتی ہے۔ تم عورتیں برابری کے دعوے کرتی اچھی نہیں لگتی ہو۔ جتنے بھی بزرگ گزرے ہیں سنت مہاتما، پیر پیغمبر سب نے ہی ایسا کچھ کہا ہے اور مذہبی صحیفوں نے بھی۔''

''وہ سارے سادھو سنت، پیر، پیغمبر مرد تھے اور صحیفے بھی یا مردوں نے لکھے ہیں یا ان پر اترے ہیں۔''

''گیان صرف مردوں کے پاس رہا۔ وہی اس کے لائق تھے۔''

سمیر نے کنکھیوں سے دونوں لڑکیوں کو دیکھا ''مردوں کے پاس ہی نہیں تم کم بخت چتر ویدیوں، دویدیوں کے پاس۔ شودروں اور عورتوں کو تم نے ٹاٹ باہر کر دیا۔''

PDF Compressor Free Version

''ارے اب تو آسمان میں تھگلی لگا رہی ہو۔ اب لے لو گیان۔ اب کیوں عقل کے پیچھے لٹھ لے کے دوڑ رہی ہو؟''

سمیر نے گاڑی روکی ان لوگوں کا پسندیدہ کافی ہاؤس آ گیا تھا۔ وہاں عمدہ کافی اور کچھ چیزوں کے علاوہ بہت ہی سیک چھوٹی چھوٹی پیسٹریاں بھی ملتی تھیں، جن پر پھلوں کے باریک ٹکڑوں سے ایسی خوبصورت سجاوٹ ہوتی تھی جیسے کشیدہ کاری کی گئی ہو۔ سبز کیوی تیز گلابی اسٹرابیری، چمکیلے زرد آڑو اور خوبانی، ارغوانی آلو بخارے انہیں باریک اور دیدہ زیب صورتوں میں تراشنا بذات خود ایک فن تھا اور ایسی ہلکی کہ بقول رضوانہ کھاکے لگتا تھا خود تتلی بن کے اڑنے لگے۔

رضوانہ سے پوچھے بغیر سمیر نے بہت سی پیسٹریاں آرڈر کیں اور چکن پف اور کپ چینو اور ماسے اس نے کہا کہ اگر وہ اپنے لئے کچھ اور منگانا چاہے تو آرڈر کر دے۔

وہ سب وہاں دیر تک بیٹھے گپ کرتے، دوستانہ جھگڑے کرتے، دھواں دھار بحثیں کرتے اور کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔

سمیر جیسا شوہر میرا کو کیوں نہیں ملا۔ میرا پیاری میرا......

میرا سے واپس ڈراپ کر رہا تھا تو میرا جو تھوڑی دیر کے لئے ذہن سے محو ہو گئی تھی پھر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔

اور میں خود؟ کیا میں سمیر کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی؟ اس نے فوراً دل و دماغ کے دروازے بند کر لئے جیسے ذرا سی درز کھلنے پر کسی بھوت کا چہرہ دکھائی دے گیا ہو۔

فلیٹ میں روشنی جل رہی تھی۔ سمیر نے باہر آ کر اس کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ''آ گئی ہے وہ..... کیا کہتے ہیں کہ ......چھمک چھلو تو کہہ سکتا ہوں نا؟''

''تم ہو ایک نمبر کے کمینے۔ خیر تھنکیو تھینکیو ویری مچ۔ کم از کم اس وقت تو تم نے ڈپریشن دور کر دیا۔''

''روز کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ رہوگی تو کبھی اداس نہیں ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے کیا وہ واقعی سنجیدہ تھا یا رضوانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس مسخرے انسان میں کہیں اندر اندر بڑی گہری سنجیدگی موجود ہے۔

''فلرٹ کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔ گدھے لگنے لگتے ہو۔ ہائی۔'' اس نے بلڈنگ کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

جوہی شاید کچھ دیر پہلے ہی لوٹی تھی۔ اس کا بیگ سامنے ہی تھا اور اس نے ابھی میک اپ بھی نہیں اتارا تھا۔ ''ہائی!'' اس نے اپنی ائر ہوسٹس والی پیشہ ورانہ مسکراہٹ پھینکی۔

جوہی مسکراتی تو اس کے دونوں گالوں میں ننھے ننھے بھنور بنتے اور وہ اوسط درجے کی قبول صورت سی لڑکی اچانک حسین لگنے لگتی۔ وہ طویل قامت اور متوازن جسم کی لڑکی تھی اور بڑے فخر سے کہا کرتی تھی، لوگ مجھے سیکسی کہتے ہیں ''ضرور کہتے ہوں گے، لیکن میرے سامنے اس طرح کی بکواس مت کیا کرو۔'' رضوانہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے کئی بار تنبیہ کی تھی۔

''تم مجھ سے کوئی چار پانچ برس بڑی ہو لیکن ہمارے درمیان بھرپور جنریشن گیپ ہے۔ آنے دو اماں اور پاپا کو تم سے خوب نبھے گی۔'' جوہی نے ایک مرتبہ جواب میں کہا تھا۔ وہ نہایت ڈھیٹ لڑکی تھی۔ اپنی زبان بولتی اور اپنی مرضی کی حرکتیں کرتی رہتی۔ اکثر نہا کر صرف ایک تولیہ لپیٹ کر نکل آتی۔ رضوانہ غصے سے گھورتی تو کہتی، تمہیں میرا جسم خوبصورت نہیں لگتا۔ مانا تم لـزبـیـئـن نہیں ہو، لیکن aesthetic sense بھی تو کوئی چیز ہے۔ پھر ایڑیوں پر گھوم کر کہتی۔ فلموں یا ماڈلنگ میں چانس مل جائے تو ہم تو اس طرح نہ جانے کتنے مردوں کے سامنے نکل آئیں تم تو عورت ہو اور اس فلیٹ کے کمرے میں بند۔''

اس کی بے باکی اور بعض قابل اعتراض الفاظ کے استعمال کے باوجود اس سے کبھی کوئی شکایت رضوانہ کو نہیں ہوئی۔ وقت پر اپنے حصے کا کرایہ ادا کرتی، گھر پر ہوتی تو کچن میں ہاتھ بٹاتی، اگر رضوانہ کام کر رہی ہوتی تو خاموشی سے دوسری طرف چلی جاتی۔

''تم پرفیکٹ انسان ہو۔ بس پیا مت کرو۔'' تعلقات میں نزدیکی آئی تو رضوانہ نے کہا۔

''تمہارے سامنے کہاں پیتی ہوں؟ انتظار میں ہوں کہ تم شروع کرو۔''

''لونڈوں کے ساتھ گھومتی ہو۔ پی کے آتی ہو تو صاف پتہ چلتا ہے۔''

PDF Compressor Free Version

اور تم؟ اولڈ میڈ بنتی جا رہی ہو۔ ذرا بوائے فرینڈز بناؤ۔ بس لے دے کے وہی ایک سمیر.....''

رضوانہ نے غصے میں بات کاٹ دی۔

''وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔''

''کیوں؟ فرینڈ بھی ہے اور بوائے بھی Gay ہے کیا؟ لگتا تو نہیں۔''

رضوانہ واقعی ناراض ہو گئی'' کترنی کی طرح زبان چلتی ہے۔ جو منھ میں آیا بک دیتی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو بوائے فرینڈ کا کیا مطلب ہوتا ہے اور تم اسے کس سنس میں استعمال کر رہی ہو۔''

''چچ چچ چچ۔ اب اگر وہ بھی صرف فرینڈ ہے تو لعنت ہے تم پر۔ کس دور کی پیداوار ہو؟''

''تمہاری دادی کے دور کی۔''

رضوانہ نے جل کر جواب دیا تھا۔

ائر ہوسٹس ہونے کی وجہ سے جوہی کب آتی تھی اور کب جاتی تھی اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ایک مشترکہ دوست کی معرفت ان دونوں کی ملاقات کرائی گئی تھی اور فلیٹ لیا گیا تھا۔ دونوں نے جو سمجھوتہ کیا تھا اس میں علاوہ دوسری شرائط کے یہ بھی تھی کہ کوئی کسی کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔

رضوانہ کو کئی بار محسوس ہوا تھا کہ جوہی کا لائف اسٹائل اس کی تنخواہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہنگا تھا، لیکن اس نے کبھی کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کیا پتہ اس کے والدین دولت مند ہوں۔ پھر یہ بات تو تھی ہی کہ جوہی پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ جو کماتی تھی اس کا اپنا تھا۔ سب اڑا دیتی ہوگی۔ نہایت لاابالی تھی۔ بتاتی تھی کہ زبردستی گھر سے لگ بھگ بھاگ کر یہ ملازمت کی تھی اس لئے کہ والدین شادی کے لئے بضد تھے اور وہ ابھی شادی کے لئے قطعی رضامند نہیں تھی۔ چھٹیوں میں نہ جانے کہاں کہاں اڑی پھرتی۔ ایک بار سنگاپور گئی تھی۔ واپس آئی تو بے تحاشہ شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔ اس میں رضوانہ کے لئے ایک یوروپین ڈریس بھی تھا۔

''میں یہ پہنوں گی؟ کبھی ایسا کچھ پہنے دیکھا ہے؟''

رضوانہ نے آنکھیں نکالیں۔

''ارے پہن لے اولڈ میڈ، سیکسی لگے گی۔''

رضوانہ کسی طرح راضی نہ ہوئی تو جوہی نے اس کے بدلے نگر مچھ کے چمڑے کا ہینڈ بیگ دیا جو بہت قیمتی تھا۔ ''میں اسے لے کر چلوں گی تو باقی حلیے کو دیکھ کر لوگ سمجھیں گے کہ میں نے اسے کسی بڑے اسٹور سے چرایا ہے۔'' رضوانہ نے تحفہ قبول تو کر لیا لیکن ہنس کر کمنٹ بھی دے ڈالا۔

''تو کپڑے بھی لا دیتی ہوں جو میچ کریں۔''

''ارے بیوقوف لڑکی۔ میرے پاس کیا پیسے نہیں ہیں۔ یہ تو اپنا اپنا لائف اسٹائل ہے۔''

''شرط لگا لو۔ تمہیں تمہارے مرد کولیگ سنڈے اسکول ٹیچر کہتے ہوں گے۔''

رضوانہ لمحے بھر کو چونک گئی۔ اپنے بارے میں یہ کمنٹ وہ سن چکی تھی۔ خود سمیر نے اسے کئی بار سنڈے اسکول ٹیچر کہا تھا۔ پارٹیوں میں جانے کا وقت بھی کم تھا اور جاتی بھی تو لباس اور میک اپ قابو میں رہتے۔ جہاں بیئر اور وہسکی سے شغل ہو رہا ہو وہاں ایک کونے میں سافٹ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی رہتی اور یہ ممبئی کی ہائی سوسائٹی نہیں تھی۔ خالص مڈل کلاس۔ ہائی سوسائٹی میں تو اس کے دخل کا سوال بھی نہیں تھا کہ وہ اس طبقے کا فرد تھی نہ اس طبقے کے کسی فرد کی دوست۔

''کہنے دو۔ تمہیں کیا۔ تم بنی رہو چھمک چھلو۔''

''ہاہاہا میری ماں کی ساری پریشانی یہی ہے کہ میں چھمک چھلو بنی پھر رہی ہوں حالاں کہ جب میں گھر جاتی ہوں تو میرا سارا میک اپ کا سامان اور پسندیدہ کپڑے یہیں پڑے رہتے ہیں۔ ویسے چھٹیاں بھی بہت کم ملتی ہیں۔''

''اور ملتی ہیں تو کہیں باہر اڑ جاتی ہو۔''

''میں کیا کروں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''ہیں نا اڑا کے لے جانے والے۔''

رضوانہ خاموش رہی۔ کسی قسم کے تبصرے کا حق اس نے خود کو نہیں تھا۔ وہ تو عمرانہ کے معاملے میں بھی نہیں بول پاتی تھی۔

PDF Compressor Free Version

جوہی خود ہی کہنے لگی۔ ''اماں کو بڑا ڈر ہے کہیں کسی ہائی فائی قسم کے دولت مند آدمی سے شادی نہ کر بیٹھوں۔ پڑھی لکھی ہیں۔ اخبار اور میگزین پڑھتی رہتی ہیں۔ کہتی ہیں اس طرح شادیاں کامیاب نہیں رہتیں۔ بس ایک ہی شادی ایسی دیکھی جو کامیاب رہی، نسلی اور مورین واڈیا۔ اب چہار دیواری کے اندر جو بھی ہو رہا ہو لیکن شادی نبھی ہوئی تو دکھائی دے رہی ہے۔''

''کیا پتہ تجھے بھی ویسا ہی شریف انسان مل جائے۔ ہائی فائی اور دولت مند ہونے کے باوجود''

رضوانہ ہنسی۔ گپ کے موڈ میں تھی۔

''اور جو کہیں جات دھرم الگ ہو گیا تو۔ زیادہ امید یہی ہے کہ الگ ہی ہوگا۔''

شادی، شادی، شادی جس برادری جس خطے میں دیکھو ماں باپ مرے جا رہے ہیں، لیکن ذات برادری کو بھی ابھی تک چمٹے ہوئے ہیں۔ ڈر کے مارے ڈھیل ڈالیں گے بھی تو اتنی کہ اونچی ذات کی لڑکی ہوئی اور اتفاق سے نکر کی ذات والا لڑکا لے آئی تو چلو مارے باندھے قبول کر لیا، مگر یہ مذہب تو بڑے مسئلے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس نے جوہی کی ماں کا تصور کیا۔ متوسط طبقے کی ڈری سہمی ماں۔ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی روایتوں میں جکڑی ہوئی ماں۔ کہیں ''ایسا ویسا'' ہو جانے کے ڈر سے رات کی نیندیں کھوتی ہوئی ماں۔ اکیسویں صدی میں پیدا ہو کر عہد وسطیٰ میں جیتی ہوئی ماں۔ بیٹی کے ائر ہوسٹس بننے پر شاید ائر کریش سے زیادہ ڈر انہیں یہی لگا رہتا ہوگا کہ نہ جانے کس ذات، کس فرقے کا لڑکا پکڑ لائے گی۔ کہیں کسی کے ساتھ بغیر شادی کیے تو رہنے نہیں لگے گی۔ کتنی کم ترقی کی ہے ماؤں نے۔ بس اتنا ہی کہ لڑکی نے ضد کی تو ائر ہوسٹس بن جانے دیا۔ ہاتھ پیر توڑ کر گھر پر نہیں بیٹھایا نہ جو پہلا لڑکا نظر آیا اس سے شادی کر ڈالی (لیکن میرا کے ساتھ تو لگ بھگ یہ بھی ہو چکا تھا)

جوہی کے والدین اکثر بلا اطلاع آ جایا کرتے تھے اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے۔ "They are keeping tabs on me." جوہی نے کہا تھا۔

کیوں تم اسے اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتیں کہ تم ان کی اکلوتی لڑکی ہو اور بھائیوں سے چھوٹی ہو اس لئے تمہاری محبت انہیں یہاں کھینچ لاتی ہے۔ تم کمبخت ماری کو چھٹیاں ملتی ہیں تو چل دیتی ہو ہانگ کانگ اور سنگاپور تفریح کرنے۔ اگلا پروگرام یوروپ کا بنا چکی ہو۔''

''سوچتی ہوں زندگی کا جتنا لطف اٹھا سکتی ہوں اٹھالوں۔ پتہ نہیں کس کمبخت مارے کے حوالے کر دی جاؤں وہ کس طرح کی زندگی دے گا مجھے۔''

''تم، تم سے تو بھوت بھی ڈرے۔ تمہارا کوئی کیا بگاڑے گا۔'' رضوانہ نے ہنس کر کہا۔

''بھوت سے بڑی چیز تم نے دیکھی نہیں وکیل صاحبہ۔ میں عمر میں پانچ برس چھوٹی، مگر تجربے میں پچاس برس آگے ہوں۔ باہر نکلو ذرا۔''

اور کتنا باہر نکلوں گی۔ رضوانہ نے سوچا۔ میری نانی گاؤں سے ہجرت کر کے پرتاب گڑھ آئیں، ممی وہاں سے نکل کے لکھنؤ پہنچیں جہاں نسبتاً بڑے شہر کی نسبتاً زیادہ آزاد زندگی تھی۔ بقول ان کے میں نے ایسے پر پرزے نکالے کہ وہ اچھا بھلا شہر چھوڑ دیا۔ اب؟

جس طرح جوہی کے والدین بے سان وگمان نمودار ہو جایا کرتے تھے ویسے ہی وہ بھی اچانک آن نکلا تھا۔ رضوانہ نے نظریں اٹھائیں تو ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ موکل براہ راست اس کے پاس نہیں آیا کرتے تھے۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اس نے کارڈ پر دوبارہ نظر دوڑائی، اکرم فاروقی۔

''جی کہیے''

''آپ سے ملنا تھا۔ آپ رضوانہ انیس احمد ہیں نا۔''

''کسی کیس کے سلسلے میں؟''

''کیا آپ کو واقعی میرے بارے میں پہلے سے کوئی اطلاع نہیں۔ اور میں بیٹھ سکتا ہوں کیا؟''

''جی ضرور بیٹھئے اور میرے خیال میں صاف بات کیجئے۔ کتنے سوال جواب کرتے رہیں گے ہم لوگ؟''

اس نے کرسی کھینچی ''میں آپ کے والدین کی مرضی سے آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ کو واضح طور پر ادا

PDF Compressor Free Version

کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے اخبار میں میرا میٹری مونیل ایڈ دیکھ کر اس کے جواب میں آپ کی تصویر اور بایوڈاٹا بھیجا تھا۔ ظاہر ہے میرے والدین نے میرا بھی بھیج دیا ہوگا۔ انہوں نے آپ کو شارٹ لسٹ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کے والدین نے آپ سے اس کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی۔''

رضوانہ قدرے پریشان ہوگئی۔ خیریت ہے اس وقت اس کے کیبن میں کوئی نہیں تھا۔ ویسے ہوتا تو وہ خود بھی کھل کر اتنی باتیں نہ کرتا۔ آدمی معقول نظر آرہا تھا۔ بات کرنے کے ڈھنگ اور ظاہری صورت دونوں کے اعتبار سے۔

''ہم یہ باتیں یہاں نہیں کرسکتے۔ لنچ آور ہے۔ چلئے پاس کی کافی شاپ میں چلتے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں میں اس سے واقف نہیں ہوں۔''

کافی شاپ میں بیٹھتے ہی رضوانہ نے پہلا سوال کیا'' آپ یہاں تک پہونچے کیسے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ممی پاپا نے میرا پتہ دے کر کہا ہوگا کہ آپ یہاں براہ راست آجائیں۔''

''نہیں۔ نہ انہوں نے ایسی ہدایت دی تھی کہ میں آپ سے مل لوں، نہ آپ کا پتہ بتایا تھا۔ فون پر گفتگو کے دوران، میرے والدین سے کہا تھا کہ ہم لوگوں کے مل لینے پر انہیں اعتراض نہیں ہوگا، بلکہ وہ اسے بہتر سمجھیں گے۔ آپ کا اور آپ کی لاء فرم کا نام آپ کے بایوڈاٹا میں تھا۔ ممبئی میں کہیں پہنچ جانا اتنا آسان نہیں، لیکن اتفاق سے میرا ایک دوست بس سال بھر پہلے تک یہاں کام کرتا تھا اور میں پونے میں ہونے کے سبب یہاں آتا جاتا رہتا ہوں۔ اب بھی کمپنی کے کام سے ہی آیا تھا۔''

رضوانہ خاموش رہی۔

''آپ کو برا لگا کیا؟ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا؟''

''نہیں برا لگنے کی بات نہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں سے ملتی رہتی ہوں۔ شاید ممی پاپا نے سوچا ہوگا کہ آپ کے متعلق اور معلومات اکٹھا کرلیں تب بات کریں۔ (اس نے دل ہی دل میں دانت پیس کر سوچا کہ ممی سے تو بعد میں نمٹوں گی۔ ابھی اس اجنبی کے سامنے ان کی عزت رکھنی ہے)

قدرے توقف کے بعد بولی: ''میری ماں بھی ملازمت کرتی ہیں۔ فرصت کی انہیں بھی کمی ہے۔ پاپا اتنے ماڈرن نہیں کہ مجھ سے براہ راست شادی کی گفتگو کریں۔''

وہ مسکرایا۔ فرصت آج کل سب کے پاس عنقا ہے۔ زندگی چوہا دوڑ بن کے رہ گئی ہے۔ rat race کے اردو ترجمے پر رضوانہ مسکرائی۔

''میں سول انجینئر ہوں۔ اس نے بات جاری رکھی۔ پونے میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ ملازمت مستقل ہے۔ کمپنی بھی خاصی بڑی ہے۔ آپ چاہیں تو اور سوال کرسکتی ہیں۔'' وہ پھر مسکرایا خفیف سی، دوستانہ سی مسکراہٹ۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا، بس بتانا ہے۔ وہ یہ کہ اپنی ملازمت اور کیریئر کو داؤ پر لگا کر شادی نہیں کروں گی۔ ممبئی چھوڑ سکتی ہوں بشرطیکہ میرے شوہر کے شہر میں میرے کیریئر کے جاری رہنے کے مواقع ہوں۔''

''مجھے ورکنگ وومن پر اعتراض ہوتا تو میں آپ سے ملنے کیوں آتا۔ میں پونا میں لگ بھگ مستقل طور پر رہتا ہوں۔ ممبئی آتا جاتا رہتا ہوں۔ یہاں ٹرانسفر یا نیا جاب لے لینے کے امکانات بھی ہیں۔ سب سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔''

''ہوں'' اس کی آنکھیں کچھ سوچتی نظر آئیں، پھر قدرے مسکرا کر بولی: ''تب تو یہ بھی صاف ہے کہ آپ کو میرے وکیل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کچھ لوگ وکیل بیوی لانا پسند نہیں کرتے۔'' پھر جلدی سے کہا'' ایسا میری ممی کا خیال ہے۔''

وہ ہنسا۔

''دیکھئے ڈر تو مجھے لگا تھا۔ اب کہیں میں کام سے دیر سے لوٹا، رات کو خراٹے لینے لگا، باتھ روم میں غیر ضروری وقت لگایا تو آپ مقدمہ ٹھوک دیں گی۔ پھر میں نے سوچا جرح کرنے میں تو معاف کیجئے گا ساری خواتین استاد ہوتی ہیں، مل ہی لوں، مل لینے میں کیا حرج ہے۔''

''بہت خوش فہم ہیں آپ۔ یہ مان کر چل رہے ہیں کہ یہ ابتدا کسی رشتے میں بدلنے والی ہے۔'' وہ پھر مسکرائی۔

''قطعی نہیں۔ میں صرف امکانات پر غور کررہا ہوں۔''

PDF Compressor Free Version

کافی ختم ہو چکی تھی۔ لنچ آور بھی اختتام پر تھا۔ رضوانہ نے بیگ سے چھوٹا سا پرس نکالا اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے پرس پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بل مجھے ادا کرنے دیجئے۔ Its a man's previlege."

"یہاں میں لائی تھی آپ کو۔ آپ مجھے نہیں لائے۔"

"اس سے فرق نہیں پڑتا۔ فرض پھر بھی میرا ہی ہے۔"

فرائض کو خانوں میں بانٹنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔

رضوانہ نے سوچا اور تیزی سے کچھ رقم پرس سے نکالی۔ کچھ ضدی معلوم ہوتی ہیں۔ اکرم فاروقی نے دل میں سوچا۔ ایسی کوئی خوبصورت بھی نہیں۔ ہاں یہ وکیلوں والا کالا سفید لباس، رنگ اختیار کرے اور پیچھے کھینچ کر باندھے گئے بال اتنا کھینچے نہ جائیں تو بہتر لگیں گی۔ جاذب نظر کہا جا سکتا ہے، لیکن چلیں گی۔ بزرگ کہتے ہیں جتنا چھانو اتنا کرکرا کھاؤ، اب کیا کیا دیکھا جائے۔ تعلیم، خاندان اس پر سے پری زاد۔

شام کو واپس آنے کے بعد رضوانہ نے سب سے پہلے ماں کو فون ملایا اور برس ہی تو پڑی: "ممی حد کرتی ہو۔ بتایا تک نہیں سیدھے سر پر سوار کرا دیا۔" قمر کے ذہن میں چھن سے کچھ ہوا۔ یہ اتنی جلدی اسے کہاں سے خبر لگ گئی۔ آج نہ مشترکہ خاندان رہ گئے ہیں، نہ مشاطائیں۔ نہ فرض کا احساس دلانے والے چچا، ماموں اور کم بخت اولادیں بھی بے نتھا بیل بن گئی ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے لئے اخبار اور میرج بیورو ہی کام آ رہے ہیں۔ اب ان کا بھی سہارا نہ لیں تو کیا کوارکوٹے چنیں۔ شادی تو آج بھی ضروری ہے۔ آگے اللہ جانے کون سا دور آئے گا، جن کے سامنے آئے گا وہ جھیلیں گے (میں اپنی ماں اور دادی سے کتنا آگے آئی ہوں؟ شاید اتنا ہی کہ بیٹی سے براہ راست اس کی شادی کی بات کرلوں اور اگر وہ خود کوئی معقول رشتہ لے آئے تو ہائے توبہ نہ مچاؤں)

"بیٹا۔ کون؟ کسے کہہ رہی ہو؟" (قمر نے سوچا پہلے تصدیق تو کرلوں کیا بات وہی ہے، جو اس نے سمجھی یا کچھ اور)

"اب بنو مت ممّا۔ خوب سمجھ رہی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔

وہ حضرت بلا اطلاع آفس میں آن موجود ہوئے۔ معلوم ہوتا تو کہیں اور مل لیتی۔ وکیل کا لباس اوپر سے بال چپڑے، کس کر باندھے ہوئے۔

چہرہ ہونق۔"

قمر کو رضوانہ کے لہجے میں تلخی کے باوجود ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ لڑکی نے دلچسپی تو ظاہر کی۔ حلیہ صحیح رکھنے کا خیال ذہن میں آیا۔ اگر بالکل ہی خلاف ہوتی تو کٹ کھنی بلی کی طرح غراتی اور ذرا پرواہ نہ کرتی کہ کس حلیے میں ملی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ رات کو بہت دن کے بعد جھاڑ کر جانماز نکالی۔ صاحبزادی خفا ضرور ہوئی تھیں، لیکن پھر بھی ردعمل نارمل تو تھا۔ کیسا لگا لڑکا، کے جواب میں ہنسی تھی۔

"لڑکا" وہ اتنا ہی لڑکا ہے جتنی میں لڑکی۔ اڑتیں برس عمر بتا کے گیا ہے۔ ویسے معقول لگا۔ بس ذرا بڑبولا ہے۔"

ہو سکتا ہے جسے تم بڑبولا کہہ رہی ہو وہ اس کا اپنے آپ کو پریزنٹ کرنے کا طریقہ ہو۔ اب تم کو اور کوئی بتانے والا تو تھا نہیں۔ وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہو گا کہ اسے نکھو بدھو نہ سمجھا جائے۔ جانے اتنے دن کنوارا کیسے رہ گیا۔ انجینئر ہے اور ملازمت میں ہے۔"

"جیسے میں ہوں۔" رضوانہ کے لہجے میں رکھائی تھی۔

"لڑکی کا کیا۔ اچھی اچھی بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ انہیں لینے کو لوگ جب ہی دوڑتے ہیں جب حسین ہوں یا دولت مند اور ہاں ڈاکٹر ہوئی تو بھی مانگ لی جاتی ہے۔ وکیل سے تو الٹا لوگ بدکتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے، ان لوگوں کو اعتراض نہیں۔ لگتا ہے ناپسند کر کے نہیں گیا۔ بیچ میں رہنے کی بات کر گیا ہے۔ ایک تو نمٹے دو میں سے۔" لیکن قمر نے اتنا کچھ کہا نہیں۔ کہتی تو رضوانہ سننے والی بھی نہیں تھی۔

قمر نے اخبار میں ضرورت رشتہ کے اشتہار دیکھنا اور نقلیں پڑھنا جاری رکھا (ایک زمانہ تھا کہ وہ اخبار میں ملازمت کے لئے "خالی جگہوں" کے اشتہار دیکھا کرتی تھیں)

اس نے انیس کو اکرم فاروقی کے رضوانہ سے ملنے کی بات بتا دی تھی۔ معاملے کو زیادہ طول نہ دیا جائے۔ انیس نے کہا تھا۔

"لڑکا جا کر مل آیا ہے۔ اب صاف بات کرے اور تمہاری صاحبزادی کیا فرما رہی ہیں۔ وہ بھی بتا دیں تو ان لوگوں کو یہاں بلا لیا جائے، یا ہم چلیں۔"

"صاحبزادی نے صاف تو کچھ کہا نہیں۔ بس یہ کہ وہ رابطہ

PDF Compressor Free Version

رکھنے کی بات کر کے گیا ہے۔ مطلب یہ تو ہے کہ 'نا' نہیں ہے۔"

انیس بھڑک گیا:

"جی ہاں اب یہ لوگ فون پر گفتگو فرمائیں گے، کمپیوٹر پر چیٹنگ کریں گے، فیس بک پر تصویریں چپکائیں گے، اس کے بعد اعلان کریں گے کہ ہمیں ایک دوسرے میں compatibility نہیں نظر آ رہی۔ کیا کہتی ہیں تمہاری دونوں بیٹیاں کہ ہمیں سب سے زیادہ "compatibility" کی ضرورت ہے۔ تم نے ڈھونڈی تھی؟ ہماری تو دوبار شادی ہوئی۔ مرحومہ کی صورت تک شادی سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اگر چھوڑ نہ جاتیں تو ہم بغیر compatibility ڈھونڈے ان کے ساتھ خوش تھے۔" پھر وہ جلدی سے بولا۔ "ویسے آپ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ خوش ہی ہیں۔"

عمر بڑھنے پر انیس بہت بولنے لگا تھا اور ادھر قمر سے بہت ناراض بھی تھا۔ اس کی ناراضگی سیلی ہوئی پھلجھڑی کی طرح وقت بے وقت چنگاریاں پھینکتی رہتی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے کچھ خواتین نے (جنہیں بقول انیس کوئی اور کام نہیں تھا۔ بچوں کو سیٹل کر چکی تھیں اور شوہر سے وہ بیزار تھیں یا شوہر ان سے بیزار تھے) ایک انجمن بنائی تھی۔ اس انجمن کو اپوا (All India Progressive Women's Association) کی حمایت حاصل تھی۔

رضوانہ نے ماں کی خوب ہمت افزائی کی۔ تمہارے ریٹائر ہونے میں زیادہ دن نہیں رہ گئے۔ اچھا ہے کسی مشغلے میں مصروف رہو گی۔ وہ بھی ایسے مثبت کاموں میں جن سے غریب عورتوں کی مدد ہو جائے۔ پاپا بھی ریٹائر ہونے ہی والے ہیں۔ دونوں لڑتے رہو گے اور زیادہ شدومد سے میری اور عمو کی شادی کرانے میں جٹ جاؤ گے۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہنسی تھی کہیں جو پہلا لڑکا دکھائی دے اسی سے نہ کر دو۔"

قمر کے جوائن کرنے کے بعد جو پہلی فریاد ان لوگوں کے پاس آئی وہ ایک گھریلو کام کرنے والی نوجوان لڑکی کی تھی۔ وہ سولہ سال میں بیاہی گئی، سترہویں سال میں ایک بیٹے کی اماں بنی اور اٹھارویں میں طلاق دے کر گھر بٹھا دی گئی۔ سسرال لکھنؤ کے مضافات میں تھا اور میکہ پرانے لکھنؤ کی گلیوں میں۔ واپس آ کر اس نے پھر گھریلو ملازمہ کا کام کرنا شروع کر دیا، بلکہ جن کے یہاں وہ شادی سے پہلے کام کرتی تھی انہیں لوگوں نے اسے رکھ لیا۔ لڑکی جس وقت گھر آئی اس کا بچہ چھ سات ماہ کا تھا۔ وہ کوئی سال بھر کا ہوا تو ایک دن اس کا شوہر آیا اور گھر میں گھس کر بچے کو اٹھا لے گیا۔ اس وقت وہاں بچے کی کم عمر خالہ تھی جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مرد اور بڑی عمر کی عورت سب اپنے اپنے روزانہ کے کاموں پر نکلے ہوئے تھے۔

"بیٹا ہے۔ بیٹی ہوتی تو چھوڑ دیتے۔ بس بہت ہوا۔ سال بھر ماں کا دودھ پی لیا۔ اب ہم گائے کا دودھ پلا کر پال لیں گے۔ باہر آنکھ مٹکا کرتی گھومتی ہے تو تم لوگ بھی تو اب کچھ اور کھلا پلا کر پال رہے ہو۔"

اس نے سخت لہجے میں سالی سے کہا تیرے پاس تو ابھی کچھ نہیں۔ وہ اس قدر گھبرا گئی کہ احتجاج بھی نہ کر سکی۔ گھر بند کر کے جا کر ماں کو بلا کر لانا اس کے بس کا نہیں تھا۔ آنسو بہاتی انتظار کرتی رہی کہ کوئی آئے تو بتائے کہ کیا واردات گزری۔ بچے سے اسے بھی بڑی محبت ہو گئی تھی۔

انجمن نے اپنی میٹنگ بلائی ابھی صرف سات خواتین تھیں اور ایک نوجوان لڑکا۔ یہ سب شدومد سے اپنی ممبر شپ اور دائرہ کار بڑھانے میں کوشاں تھے۔ لڑکی ان کے سامنے آئی تو سب نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ آنکھوں سے آنسو تو رواں تھے ہی، اس کا کرتا سامنے سے دودھ کی دھاروں سے بھیگ رہا تھا۔ کئی خواتین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پلکیں جھپکائیں۔ ان کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا تھا۔ نوجوان لڑکا کچھ حیرت، کچھ گھبراہٹ کے عالم میں ایسا کچھ ہوتے دیکھ رہا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسے فوری طور پر سمجھ پانے سے قاصر تھا۔

خواتین نے لڑکی کی روداد سنی، اسے تسلی دی اور طے کیا کہ وہ پچیس کیلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس کے شوہر اور سسرال والوں سے مل کر سمجھائیں گی کہ کم از کم پانچ برس تک وہ بچہ نہ لیں۔ اس کے بعد جو اشنٹ کسٹڈی طے کر لیں ورنہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے گا اور عدالت ماں کے حق میں پانچ برس سے زیادہ کا فیصلہ کرے گی۔

"ہم نے میتھلی شرن گپت کی کویتا 'ابلا جیون ہائے تیری یہی کہانی' آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی' کو اس طرح ساکار

PDF Compressor Free Version

ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ہم سب Symbolic سمجھتے تھے۔ یہ تو ساکشات سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔'' انجمن کی سکریٹری شانتی بھٹناگر گاڑی چلا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا ان کے لہجے میں دردمندی بھی تھی اور ایک طرح کی حیرت بھی۔

''اور میتلی شرن گپت کو یہ لکھے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا۔ آج آبادی کا بڑا حصہ وہیں کا وہیں تھما ہوا ہے۔'' قمر نے تاسف کے ساتھ کہا۔

''change تو دکھائی دے رہا ہے، لیکن بس یونہی کہ سڑک پر بڑھیا بڑھیا امپورٹڈ گاڑیاں ہیں اور بیل گاڑی بھی چل رہی ہے۔

''ہاں دیکھئے نا، ابھی ایک بارات میں گئے تھے۔ دولہا انجینئر تھا۔ لڑکی بنگلور میں ساتھ پڑھتی تھی، لیکن مائکہ بہار کے کسی ایسے گاؤں میں تھا جو بالکل ہی اللہ میاں کے پچھواڑے تھا۔ لڑکے والوں کی کاریں ایک مخصوص پوائنٹ پر روک دی گئیں۔ آگے جو پگڈنڈیاں تھیں ان پر صرف بیل گاڑی چل سکتی تھی۔''

مسز نگم نے پہلے بھی یہ قصہ سنایا تھا۔ دراصل وہ اس قدر حیرت زدہ تھیں اور محظوظ بھی کہ سناتی رہتی تھیں۔ ''اور دولہا کو ہاتھی پر بٹھایا گیا۔'' قمر نے لقمہ دیا جو وہ قصہ پہلے سن چکی تھیں۔

ہاہاہا۔ مسز نگم ادھیڑ عمر خاتون تھیں، لیکن نوجوان لڑکیوں کی طرح بات بے بات قہقہے لگاتی تھیں۔ ''سب سے مزیدار بات یہ تھی کہ رخصتی کے وقت دلہن اچک کر بندریا کی طرح ٹریکٹر پر بیٹھی۔ پھر بیل گاڑیوں، ہاتھی اور ٹریکٹر پر لدا گیا یہ قافلہ وہاں پہونچا جہاں باراتیوں کی کاریں کھڑی تھیں۔ چلئے اب ذرا ان صاحب سے نمٹیں جو ماں کی گود سے بچہ لے کر بھاگے ہیں۔'' چونکہ وہ بستی قریب آگئی تھی جہاں کا پتہ دیا گیا تھا۔ خواتین چوکس ہوگئیں۔

بتائے ہوئے مکان سے وہ نوجوان لڑکا برآمد ہوا جو اس لڑکی کا سابق شوہر تھا۔ اس کے تیور نہایت جارحانہ تھے۔

''کون ہیں آپ لوگ؟ یہاں کیوں آئی ہیں؟ یہاں نہ پولیو کی دوا پلانی ہے نہ بچے پیدا کرنا بند کرنے کے طریقے بتانے ہیں۔ ایک ہی بچہ ہے ہمارا۔ پولیو کی دوا پلا چکے ہیں۔''

''بچے کی ماں کہاں ہے؟''

''چچگی میں مرگئی تھی۔''

''نام بتاؤ''

''کیوں بتائیں؟''

''ہم لوگ چچگی میں ہونے والی موت یا کم عمر بچوں کی موت کا لیکھا جوکھا رکھ رہے ہیں۔''

''خلیفن کہاں ہے؟''

آوازیں سن کر اندر سے ایک عورت نکل آئی تھی۔ ادھیڑ عمر، تیز طرار۔ کمر پر ہاتھ رکھے۔

''اس کی بات کون پوچھ رہا ہے؟ بھاگی ہوئی عورت کی؟ اس سے ہمارا اب کوئی رشتہ نہیں۔''

''آپ لوگوں نے ملے نہیں کیا ہے کہ خلیق النسا کے بارے میں کیا کہنا ہے۔ وہ مرگئی ہے یا بھاگ گئی ہے یا اسے طلاق دی گئی ہے۔''

''ہاں تو بھاگ گئی تھی اس لئے بیٹا ہمارا کیا کرتا۔ ایسی عورت کو واپس لاتا؟ ہم غریب ہیں تو کیا ہماری عزت نہیں ہے؟'' وہ عورت بڑے جارحانہ انداز میں بول رہی تھی۔

قمر یکلخت سناٹے میں آگئی۔ جب میرا سے اس کے شوہر اور سسرال والوں نے پلا جھاڑنا چاہا تھا تو انہوں نے اس کے ماضی سے ایک ایسا لڑکا ڈھونڈ نکالا تھا جس سے کبھی اس کے مراسم رہے تھے، گرچہ اس نے پوری طرح اپنے شوہر کو قبول کیا تھا، لیکن انہوں نے آخری فیصلہ کرتے وقت اسے بدچلنی کا مورد الزام ٹھہرایا۔

یہ کون بول رہا ہے؟ ایک نچلے طبقے کی جاہل عورت اور اس کا ایک گارمنٹ فیکٹری میں کپڑے پیک کرنے کا کام کرنے والا بیٹا جو محض اتنا پڑھا لکھا تھا کہ دستخط کر لیتا تھا یا ایک اونچے متوسط، اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے کا انجینئر اور اس کی ڈگری یافتہ ماں؟ اسے ایسی چپ لگی کہ پھر کچھ بولی ہی نہیں۔ بعد میں ان لوگوں نے پوچھا بھی کہ آخر وہ اس قدر خاموش کیوں ہوگئی تھی۔

خواتین نے ان دونوں سے آرام سے بات کرنے کو کہا۔ خود ان کی بدکلامی کا ذرا بھی اثر نہیں لیا۔ لڑکے کو اغوا کر کے لانے کو قانونی جرم بتایا۔ دودھ پیتا بچہ عدالت ماں کے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ

PDF Compressor Free Version

کرے گی۔ ٹھنڈے دماغ سے سمجھنے کو کہا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کا ٹیپ کا بند یہ تھا کہ اس آوارہ لڑکی نے یار سے بغیر کسی رکاوٹ شادی کرنے کے لئے بچے کو بیچ دیا ہے۔

''ہمیں تو یہ بھی پتہ ہے کہ کتنے میں؟''

''تو آپ اپنے بچے کو بچانے کیوں نہیں گئے؟'' اس کا جواب تھا کہ اسے بہت بعد میں پتہ چلا اب بچہ کہاں ہے کون جانے۔ شاید کوئی صاحب اسے لے کر فرار ہو چکا ہے۔

ان لوگوں کی مزید کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اس لئے کہ اس دن ان خواتین کے وہاں پہنچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے کی دادی اسے لے کر نہ جانے کہاں فرار ہو گئی۔ کارروائی جاری رہی۔ اب بھی جاری تھی۔ خلیق النسا کے دودھ کی دھاریں گرتے گرتے خشک ہو گئیں۔ آنسوؤں کے سوتے البتہ کبھی خشک نہیں ہوئے۔

انیس ہمیشہ قمر کا مذاق بناتا رہتا تھا بلکہ باقی سب خواتین کا بھی۔ اس کے مذاق بنانے میں مذاق اڑانے کا عنصر حاوی رہتا تھا، ایک پرخلوص طریقے سے بیوی کو چڑانے، ہنسی ٹھٹھا کرنے کا نہیں۔ اسے یہ ساری خواتین فضول لگتی تھیں۔ اپنا اپنا گھر سنبھال لیں وہی بہت ہے۔ چلیں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے۔ ایک دو ٹکے کے آدمی کو راہ راست پر نہ لا سکیں اور وہ گالیوں کی بوچھار پر اتر آیا۔ قمر کی شامت آئی تھی وہ انیس کو بتا بیٹھی کہ دوسری ملاقات میں شکل دیکھتے ہی اس نے بے نقط سنانی شروع کی تھیں اور ان مکلف خواتین سے ذرا نہیں ڈرا تھا جو کار پر بیٹھ کر اس کے غریبانہ دروازے پر آئی تھیں۔ بستی کے بہت سے لوگ نکل کر ٹھی ٹھی ٹھی کر کے ہنسنے لگے تھے اور ان لوگوں نے گرچہ اوپر سے ظاہر نہیں ہونے دیا، لیکن اندر ہی اندر نہایت شرمندہ ہوئیں۔ کاہے کو کبھی کسی نے انہیں اختو بختو، کٹنی، حرافہ جیسی گالیاں دی ہوں گی اور سب پر مستزاد چھنال جو اپنی جیسی چھنال کی حمایت میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔

خیر گزری جو قمر نے یہ الفاظ نہیں دوہرائے تھے ورنہ انیس بالکل ہی استقبے سے اکھڑ جاتا۔

اس سے پہلے یہ انجمن ایک معاملے میں دھرنا دینے جا رہی تھی اور کئی خواتین پہنچ بھی گئیں، لیکن انیس نے سختی سے کہہ دیا کہ اگر قمر کسی دھرنے جیسی ایکٹیوٹی میں شریک ہوئی تو وہ سرے سے اس کا ان میٹنگوں میں جانا بند کر دے گا۔ اس نے بتایا کہ ایک معاملے میں اسی طرح کی کسی انجمن کی اراکین نے کہیں دھرنا دیا تھا۔ ان میں ایک آئی۔ پی۔ ایس افسر کی بیوی بھی تھیں، جو فیمنسٹ ایکٹوسٹ تھیں۔ کچھ دن بعد ان کے شوہر کو شنٹنگ میں ڈال دیا گیا تھا۔

قمر کے عدم تعاون کا تذکرہ ہوا اور اس پر کتنا چینی بھی ہوئی، لیکن اس نے کہہ دیا کہ وہ ایک حد تک ہی شریک ہے، اس کے آگے نہیں۔ خواتین کہنے لگیں، چلو اسی کے گھر پر دھرنا دیتے ہیں۔

''کیا تیر مار آئیں؟'' انیس نے پوچھا۔

''پچھل سکا؟''

''نہیں، مگر شاید آگے کچھ بات بنے۔'' انیس ہنسا۔ یہ ہندوستان جنت نشان ابھی مزید سو برس یونہی چلتا رہے گا اور یہ آپ کا فیمنزم یہ مغرب سے آیا ہے اور وہاں کیا حال کیا ہے سماج کا، سود یکھ لیجئے۔ طلاق کے ڈر، بچوں کی چھیچھا لیدر کے خوف سے اب بیشتر لوگ شادی ہی نہیں کر رہے۔ گوروں کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے۔''

''انیس، فیمنزم صرف زن وشو کے تعلقات تک تھوڑی ہی محدود ہے۔ اب اسی معاملے کو لے لو ہم کوئی طلاق شدہ جوڑے کو دوبارہ یکجا کرانے نہیں گئے تھے۔ ماں کو اس کا حق دلانا چاہتے تھے۔''

''پہلے اپنا حق مادری تو لے لو۔ تمہاری بیٹیاں تمہیں ٹھینگا دکھا کر نہ جانے کیا کیا کرتی گھوم رہی ہیں۔'' قمر چپ ہو گئی پھر اس نے نظر بھر کر انیس کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر درشتی نہیں، تاسف تھا۔ کچھ عرصے سے اس نے بھی لڑکیوں کے معاملے میں ہتھیار ڈال دیے تھے اور ان سے کسی طرح کی بحث میں نہیں الجھتا تھا۔ قمر کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ کچھ پرانے خیال کا ضرور تھا کچھ سخت گیر اور اپنی بات منوانے والا، لیکن اس کی ساری ہیکڑی لڑکیوں نے بھلا دی تھی۔ وہ بدتمیزی نہیں کرتی تھیں، لیکن بڑے اطمینان سے جو چاہتی کرتی رہتیں۔ ویسے کوئی بڑی بغاوت بھی نہیں کی تھی۔ ابھی تک تو نہیں۔ قمر کو سارے اگر مگر کے باوجود اس سے بڑی محبت تھی۔ وہ گھر کا کھیا تھا، ہیڈ آف اسٹیٹ، اس کے اس تصور نے رشتے کو سنبھال کر رکھا تھا۔ اس محفوظ گھونسلے میں بڑی عافیت

PDF Compressor Free Version

تھی۔ پتہ نہیں یہ لڑکیاں کیا سوچ رہی ہیں۔ بڑھاپا تنہا گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج انیس کا ساتھ کیسا غنیمت لگ رہا ہے۔ وہ انیس کے پاس گئی اور اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ''چائے بناؤں'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔ ''چائے بناؤں؟ پوچھنے کی ضرورت ہے؟'' اس نے قمر کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ نہ لہجے میں محبت تھی، نہ آنکھوں میں، لیکن دسوں انگلیاں زبان تھیں، شیریں زبان۔

''ویسے ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ خوش ہی ہیں۔'' کئی بار کہا تھا اس نے۔

قمر نے رضوانہ کو فون کیا۔ ''تمہارے پاپا چاہتے ہیں کہ اس بات کو جلدی ہی ایک رخ دیا جائے۔''

''کس بات کو؟''

''بنومت۔ میں اکرم فاروقی کی بات کر رہی ہوں اور تم جانتی ہو کہ میں اس کی بات کر رہی ہوں۔''

''مما، قسم خدا کی، اس وقت وہ میرے ذہن میں دور دور نہیں تھا، لیکن آپ یہ بتایئے کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں۔ اپنا اسٹینڈ بتا چکی ہوں۔ مجھے وہ شخص ناپسند نہیں ہوا، لیکن سمجھ میں بھی نہیں آیا۔''

''بیٹا یہ یوروپ یا امریکہ نہیں ہے، ہندوستان ہے۔ یہاں سمجھنا سمجھانا سب شادی کے بعد ہوتا ہے، جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ ظاہری ہی ہوتی ہیں۔ اصل شخصیت ساتھ رہنے کے بعد کھلتی ہے اور بیٹا ہر رشتے میں ایڈجسٹمنٹ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔''

''تو جایئے پوچھئے نا اس سے۔ دو لانبی لانبی میلز بھیجنے کے بعد سے خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اب مجھے اس سے عشق تو ہوا نہیں ہے کہ پیچھے پڑ جاؤں۔''

قمر کچھ خفیف ہو گئی۔ واقعی اب تو انہیں لوگوں کو رابطہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ خاموش ہو گیا ہے تو اسے ہم کیا معنی پہنائیں۔

انیس کے سوال کرنے پر اس کے والدین نے کہا: ''ہم ابھی تک لڑکے کے فائنل جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ ویسے رشتے تو اور بھی زیر غور ہیں۔'' قمر کا دل بیٹھنے لگا۔ خدا خدا کر کے لڑکی نے کہا تھا کہ اسے لڑکا ناپسند نہیں ہوا ہے۔

پھر جیسے وہ پہلے اچانک آنکلا تھا ویسے ہی دوبارہ نمودار ہو گیا۔ بقول رضوانہ کی گہری دوست نرگس واجی رضوانہ کی زندگی کے افق پر۔

کافی شاپ میں اس نے رضوانہ کی پسندیدہ کولڈ کافی وِد آئس کریم آرڈر کی اور اپنے لئے کیپچینو پھر اِدھر اُدھر کی گپ کرنے کے بعد اس نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے کہا: ''تو رضوانہ صاحبہ کیا ہم لوگ تیار ہیں؟ کیا اپنے اپنے والدین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں آگے جو کارروائی کرنی ہے وہ کریں۔''

اچانک رضوانہ کو اپنے گرد و پیش کی پوری دنیا تبدیل ہوتی نظر آئی۔ کیا وہ بھی ایک عام سی نارمل ہندوستانی لڑکی کی طرح کسی کے گھر میں اس کی بیوی بن کر رہے گی؟ اس کے بچوں کی ماں بنے گی؟ شام کو بن سنور کر (کیا گھٹیا خیال ہے) اس کا انتظار کیا کرے گی؟ اس کے گرد وہ حفاظتی خول ہوگا جسے شادی کہتے ہیں، وہ محافظ ہوگا جسے شوہر کہتے ہیں، وہ اس آدھی ادھوری زندگی سے کٹ کر خود کو مکمل محسوس کرے گی۔ اس کے والدین چین کی سانس لیں گے، لیکن کیا واقعی وہ بھی اس زندگی کو ادھوری سمجھ رہی تھی؟ یہ لفظ آیا کیوں اس نے ذہن میں اس کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ شاید لب بھی کانپے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس شخص کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خلوص تھا۔

''اس سے قبل کہ آخری فیصلہ ہو، مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔''

وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ کیا کسی افیئر کا اعتراف کرنے والی ہیں۔ میں نے اس دوران جو تفتیش کی اس میں تو انہیں کلین چٹ ملتی نظر آئی تھی۔ لمحہ بھر میں اس کے ذہن میں نہ جانے کتنے خیال آ کر گزر گئے۔

''کہیئے۔'' اس نے کہا:

''میری پنڈلی پر ایک چھوٹا سا سفید داغ ہے۔ یہی کوئی چونی برابر یا شاید ذرا سا بڑا۔''

اس کی پریشانی مایوسی میں بدلتی دکھائی دی جس کو نظر انداز کرتے ہوئے رضوانہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

''پچھلے پانچ سال سے اتنا ہی ہے، بڑھا نہیں۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ لیوکوڈرما نہیں ہے، لیکن میں بتا دینا مناسب

PDF Compressor Free Version

سمجھتی ہوں۔ کسی پردہ دار جگہ پر نہیں ہے۔ آپ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس نے جھک کر ساری ذرا سی اوپر چڑھانی چاہی۔"

"اس کی ضرورت نہیں، میں دیکھ کر کیا کروں گا۔ آپ مجھے ڈاکٹر کی رپورٹ دکھا سکیں تو بہتر ہوگا۔" ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ڈوبتا تنکے کا سہارا لے رہا ہو۔

رضوانہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ میرے پاس کسی ڈاکٹر کی رپورٹ محفوظ نہیں ہے۔ بھروسہ کر سکتے ہیں تو کریں۔ میں خاموش بھی رہ سکتی تھی۔ اسے کسی زخم کا نشان کہہ کر بات چھپا بھی سکتی تھی۔ وہ بھی جب، جب یہ آپ کی نظر میں آتا۔ میں نے تو حتی الامکان کوشش یہ کرنی چاہی کہ ابتدا میں ہی کوئی اختلاف کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا: "کیا ہم کسی ڈاکٹر سے فریش رپورٹ لے سکتے ہیں؟"

"میں نے جب اسے پہلی بار نوٹس کیا تو والدین کے ساتھ جا کر لکھنؤ کے کنگ جارج ہاسپٹل کے جلدی امراض کے شعبے میں مکمل چیک اپ کرا لیا تھا۔ اب میں آپ کے ساتھ چیک اپ کے لئے جانا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ آپ میری ایمانداری کی قدر نہیں کر رہے۔ مجھ پر یقین نہیں کر رہے۔"

"ٹھیک ہے سوچ کے بتاتا ہوں۔" وہ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد اٹھ گیا۔ اس بار اس نے کافی کا بل بھی رضوانہ کو ادا کرنے دیا۔ پونے واپس آ کر اس نے انگوٹھی کی ڈبیہ جیب سے نکال کر وارڈ روب کے لاکر میں رکھ دی۔

"الو کی پٹھی!" سمیر نے دھپ سے رضوانہ کے شانے پر ہاتھ مارا، لیڈی ڈائنا اسپنسر کو Virginity Test سے گزرنا پڑا تھا اور تم پنڈلی کے اس چوٹی بھر داغ کا ٹسٹ کرانے نہ گئی کہ اسے اطمینان ہو جاتا۔ اتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے گنوا دیا۔ اب دلتی رہو مونگ اماں ابا کی چھاتی پر۔"

"اور سماج کی چھاتی پر بھی" نرگس نے لقمہ دیا۔ نرگس جلد ہی انعام دار کے فلیٹ میں منتقل ہونے جا رہی تھی۔ انعام دار مسلمان تھا پارسیوں کی تعداد تشویشناک حد تک کم ہونے کے باوجود یہ لوگ اب بھی برادری سے نکل جانے والی لڑکی کی اولادوں کو پارسی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ ان کے یہاں تبلیغ بھی نہیں تھی، پھر بھی لڑکیاں باہر شادی کر رہی تھیں اور اس فرقے میں آنر کلینگ نہیں تھی نہ زیادہ رولا پٹا تھا۔ بزرگ کچھ تشویش کا اظہار ضرور کر لیتے تھے۔ نرگس کے دادا، دادی نے کچھ نصیحتیں ضرور کیں۔ کچھ اونچ نیچ سے آگاہ بھی کیا تو اس نے کہا "ارے ابھی تو ہم صرف تجربہ کر رہے ہیں، کون سا بیاہ کر رہے ہیں۔ ابھی بچے نہیں پیدا کریں گے۔ شادی کی تو دیکھا جائے گا، ورنہ ہم اپنے رستے اور شارق اپنے رستے۔" یہ پورا مکالمہ دادا، دادی کی نقل کر کے اس نے قریبی دوستوں کے حلقے میں سنایا تھا۔ شارق اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا اور پھر باپ کا بزنس سنبھال رہا تھا۔ متمول والدین کا بیٹا تھا۔ پتہ نہیں اس نے اپنے گھر میں کیا سبق پڑھایا تھا۔

یہ کون سا سماج ہے؟ یہ ہندوستان کا کون سا چہرہ ہے؟

نرگس اور سمیر بقول خود رضوانہ کی ٹریجک کامیڈی یا کامک ٹریجیڈی (اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا کہ واقعے کو کیا نام دیا جائے) کو سیلیبریٹ کرنے کافی شاپ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان کو چند اور قریبی دوستوں کو انتظار تھا کہ لکھنؤ جا کر وہاں کے مشہور و معروف باورچیوں کا پکایا روایتی قورمہ بریانی کھائیں گے اور رضوانہ کو اتنا تنگ کریں گے کہ وہ سچ مچ کسی روایتی دلہن کی طرح روتی دھوتی رخصت ہو سکے، ورنہ وہ تو رخصتی کے وقت رونے والی تھی نہیں۔

"لیڈی ڈائنا اسپنسر کو برطانیہ کے تخت و تاج کا وارث مل رہا تھا۔ بعد میں جو تعلقات رہے ان کی پیشنگوئی کرنے والا تو کوئی تھا نہیں اور ویسے اس کی اولاد تو وارث ہو ہی گئی۔" رضوانہ نے جل کر منہ مارا۔ "مجھے کسی سلطنت کا وارث پرپوز کرے تو شاید اسکن اسپیشلسٹ کے پاس تو چلی جاؤں، لیکن کنوارپن کا سرٹیفکٹ لانے کو کہا تو گولی مار دوں گی۔"

"کیوں؟ ورجن نہیں ہو کیا؟ ڈر جاؤ گی ٹسٹ سے؟" سمیر نے قہقہہ لگایا۔

"کمینے ہو تم۔ صریح کمینے۔ کسی ملک کا تاج اس ذلت کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ اس ترقی یافتہ ملک کی اس لڑکی نے یہ کیسے گوارا کیا

PDF Compressor Free Version

اور شاہی خاندان کی ہمت بھی کیوں کر ہوئی۔ پرنس چارلز کا ٹسٹ نہ کرایا؟ تم سالے جہاں جی چاہے، جب جی چاہے منھ مارو اور ہم اپنا جسم لئے بیٹھے رہیں، پھر لاکھ کہیں کہ ہاں ورجن ہیں تو یقین نہ کرو۔ جب ہم میں اپنی مرضی سے جسمانی رشتہ بنانے کی ہمت آئے گی تو اسے تسلیم کرنے کی ہمت بھی ہوگی۔''

''باپ رے باپ ورجینا وولف، کیٹ ملر، سیمون دی بوا، رضوانہ انیس آگے آیت۔ تحریک ختم۔''

''ہندوستان میں فیمنزم آیا ہی کہاں ہے۔ آئے تو سہی'' رضوانہ ابھی تک خفا تھی۔

''فیمنزم والیاں جتنی برابری چاہتی ہیں وہ کبھی نہیں آسکتی۔ کیا مارکسزم کے بعد معاشی برابری آئی؟ طبقاتی فرق مٹا؟ کیا سارے پیر پیغمبروں کے بعد سماجی برابری آئی۔ ذات پات ہٹی؟ اہنسا کو مذہب کی بنیاد بنانے والے بدھسٹ روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں اور چین نے اس سے پہلے تبت کے ساتھ کیا کیا؟ اب مانو نہ مانو قدرت نے ہی عورت کو ایسا بنایا ہے کہ مکمل مساوات کی مانگ.....'' نرگس شستہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

''نرگس تم عورت ہو کر؟''

رضوانہ نے بات کاٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''جس دن بچے گملوں میں اگنے لگیں گے اس دن عورت برابری کا دعویٰ زیادہ مضبوطی کے ساتھ کر سکے گی، لیکن ابھی تک تو سائنس ایسا کچھ نہیں کر سکا ہے۔ بچہ اب بھی ماں کی کوکھ میں پلتا ہے۔ وہ کرایے کی کوکھ کیوں نہ ہو، لیکن ہوتی تو عورت کے اندر ہی ہے۔ ہاں برابری کا سلوک، انسان سمجھنا، فیصلوں میں ساجھے داری.....''

''یار Cut the crap سمیر بور ہو کر بولا۔ شاید ہم کچھ سیلیبریٹ کرنے آئے تھے۔ رضوانہ کی پسند کے سنہرے جھینگے آرڈر کریں؟ تم پڑھی لکھی عورتیں جہاں بیٹھو گی وہاں یہی سب ڈسکس کرو گی۔ بھول جاؤ گی کہ زندگی میں کچھ اور بھی ہے۔'' (کیا زندگی میں کچھ اور کی ہی تلاش میں رضوانہ نے اکرم فاروقی پر غور نہیں کیا تھا؟ کیا بظاہر خوش اور مطمئن نظر آنے والی لڑکی زندگی میں کچھ اور آسودگیوں کی متلاشی نہیں تھی؟)

''ایک بات بتاؤ سمیر''

سمیر نے پہلے نظر بھر کر رضوانہ کو دیکھا پھر نرگس سے مخاطب ہوا میں نے سوال کیا تھا۔ ''بولو''

''تمہاری بیوی تم سے زیادہ کوالیفائڈ ہو، یا زیادہ تنخواہ لا رہی ہو یا دونوں.....''

''اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ کہاں ہے وہ مجھ سے زیادہ تنخواہ والی۔ ملاؤ۔'' وہ بہت خوش ہو کر بولا۔

''مسخرہ پن نہیں۔''

''بالکل نہیں۔''

''اچھا اگر تم اس بینک والے کی جگہ ہوتے.....''

''کون بینک والا۔؟''

جس کی بیوی نے کوی سمیلن میں جا کر کویتا پڑھنے کی جرأت کی تھی اور شوہر نے گھر آنے کے بعد پیٹا تھا کہ اس نے مردوں کے خلاف کچھ کہہ دیا تھا گرچہ اس میں اس کے شوہر کی طرف قطعی کوئی اشارہ نہیں تھا۔''

''میں تصور کے سہارے کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب تک انسان واقعی اس سچویشن میں نہ ہو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا پتہ بیوی اپنے achievements کے نشے میں شوہر کو اسکرٹ پہنا کر خود پینٹ پہننے کے پھیر میں ہو اور مجھ سے کٹھ حجتی پر کیوں اتری ہوئی ہو۔ جاؤ جا کے اس کم بخت اکرم فاروقی کو پکڑو۔ ویٹر.....'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور جیسے کسی کوئز کے مقابلے میں تیز گام (Rapid Fire) سوالات داغے جائیں اس طرح دھڑا دھڑ آرڈر دیا۔ ''دو پلیٹ گولڈن فرائیڈ پران، ایک پلیٹ چیز پکوڑے، دو کپ چینو، ایک کولڈ کافی، دو آئس کریم بعد میں جو اور مانگیں۔'' ماحول کچھ بھاری ہوا تھا۔ بڑے مصنوعی لمحات میں مصنوعی قہقہے لگاتے ہوئے ان تینوں اچھے، مخلص دوستوں نے شام اور کافی دونوں سے لطف اندوز ہونے کی اداکاری کی۔

رضوانہ نے ماں سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا، لیکن قمر انیس سے یہ بات چھپا گئی کہ بیٹی صاحبہ اتنی بڑی ستیہ وادی ہریش چندر بنتی ہیں کہ

PDF Compressor Free Version

اس بے ضرر سے داغ کو بھی نہ چھپا سکیں اور اچھا بھلا رشتہ کٹوا دیا۔ انیس پتہ نہیں کتنا ہنگامہ کھڑا کرتا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش رہ گیا کہ لڑکے والوں کو کہیں کچھ اور زیادہ پسند آ گیا ہے۔ قمر نے البتہ رضوانہ کو اچھی طرح کھری کھوٹی سنائیں۔ یہاں تک کہا کہ سامنے ہوتی تو ایک آدھ جھاپڑ بھی رسید کر دیتی۔ ''کیا مما، کیا قیامت آ گئی؟ ارے ابھی میں بوڑھی تھوڑی ہی ہوئی ہوں۔ ابھی بہت گنجائش ہے۔ دوسرے یہ کہ خوش ہوں۔ مجھے کوئی کامپلیکس نہیں ہے، اس بات کو لے کر کہ میری شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔'' رضوانہ نے اپنی خفگی پر قابو پا کر ماں کو تسلی دی۔ بعد میں خود ان کے لئے افسوس کرنے لگی۔ بے چاری پڑھ لکھ کر بھی سسٹم سے باہر نہیں آ سکی ہیں اور پاپا وہ تو بالکل روایتی ہیں۔ بہت سا نکراؤ تو اس لئے بھی ہے کہ عورتیں بدل رہی ہیں، مرد اپنی جگہ ویسے کے ویسے ہیں۔

''رضوانہ، ارے بیوقوف لڑکی، مجھے ملیں یہ تمہاری بڑے بڑے دعوے کرنے والیاں تو میں ان سے پوچھوں کہ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر تم ہمسری کا دعویٰ کہاں سے کر لیتی ہو۔ ابھی ایک سروے رپورٹ آئی ہے کہ طلاق یا رنڈاپے کے بعد شادی کرنے والے مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔''

''مجھے نہیں پتہ مما آپ کیا کیا پڑھتی رہتی ہیں اور پھر اسے میرے پر لاد دیتی ہیں۔''

''میں صرف یہ بتا رہی ہوں کہ ایک عورت کے لئے عمر بہت اہم ہے۔ تم جن عورتوں کی مثالیں دیتی ہو وہ فلم اور ماڈلنگ کی دنیا کی عورتیں ہیں۔ وہ تیس بتیس برس کنواری رہتی ہیں اس کے بعد یا تو کوئی کم عمر لڑکا ملتا ہے، جو کچھ دن بعد چھوڑ کر بھاگ لیتا ہے یا پھر کوئی ایسا ملتا ہے، جس کی ایک یا دو بار شادی ہو چکی ہے۔''

رضوانہ بہت خفا ہو گئی۔ ''لیکن شادی لکھی کسی حکیم نے نسخے میں ہے۔ نہیں کرتے ہم۔ تم عمو کو پکڑو۔ دو میں سے ایک سے نمٹ کے گنگا نہاؤ۔'' اس اچانک میل نے رضوانہ کو حیران کر دیا، بالکل ایسے ہی جیسے اس کی آمد نے حیران کیا تھا۔ میل باکس میں اوپر ہی اکرم فاروقی کا نام تھا۔ رضوانہ کے ذہن میں کمبخت خیال آیا کہ شاید اس نے معافی مانگی ہے یا یہ کہ اس نے لکھا ہے کہ وہ اس داغ کی بات بھلا کر تعلقات چاہتا ہے یا پھر اس نے رضوانہ کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ دوبارہ چیک آپ کے لئے راضی ہو جائے تو اس کے حق میں اچھا ہوگا۔ اس طرح کی کسی بھی چیز کے لئے چوکنا تو رہنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اب اس کی کسی تجویز سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ گھٹیا انسان، رضوانہ نے سر جھٹک کر سوچا اور میل نہیں دیکھی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد اس نے قانون کی ایک موٹی سی کتاب اٹھائی۔ جو ہی دوسرے شہر میں ہوگی، آج اس کی واپسی نہیں تھی۔ اس نے اطمینان سے ایک کیس کے سلسلے میں کچھ حوالے دیکھے۔ ضروری نوٹس بنائے، دل کچھ بے چین محسوس ہوا۔ ایک بے کلی، خاصی رات گزر جانے کے بعد بھی نیند آنکھوں سے دور۔ چلو یہ خلش دور کر ہی لوں، اس نے میل کھولی، اس کی آنکھیں پھیل گئیں، میل میں ایک دعوت نامہ تھا۔ اکرم فاروقی کی شادی کا کارڈ۔ اگلے ہفتے اس کی شادی یہیں ممبئی میں ہی ہو رہی تھی۔ چند سطریں الگ سے تھیں۔

''آپ سے جو سابقہ رہا اس سے ایک دوستانہ تعلق بن ہی گیا ہے، ہم لوگ جس رشتے کی طرف بڑھے وہ تو نہیں ہو سکا، لیکن جو بنا وہ برقرار رہ سکتا ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں آپ کو بارات میں مدعو کر رہا ہوں۔ ریسپشن میرے آبائی گاؤں میں ہوگا۔ وہاں شاید آپ نہیں آ سکیں گی، لیکن یہاں شریک ہو سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ ساتھ کے لئے اپنے کسی کولیگ یا دوست کو لانا چاہیں تو لا سکتی ہیں۔''

ہمت تو دیکھو۔ رضوانہ نے دانت پیسے، بیٹا تم میرا ظرف آزما رہے ہو۔ وہ بھی دیکھ لینا، اس نے اسی وقت جواب ٹائپ کیا۔ مبارک ہو اکرم فاروقی صاحب میں شرکت کی پوری کوشش کروں گی۔ بلکہ آپ کے آبائی گاؤں بھی آ سکتی ہوں، لکھیم پور لکھنؤ سے بہت قریب ہے، اس بہانے مجھے گھر آنے کا موقع مل جائے گا۔ چھٹیاں ڈیو ہیں۔ امید ہے آپ نے لڑکی کو خوب ٹھوک بجا کے دیکھ لیا ہوگا۔'' کچھ سوچ کر اس نے آخری جملہ کاٹ دیا، میل بھیج دی اور چادر تان کر آرام سے سو گئی۔ اکرم فاروقی دنیا تمہارے اوپر ختم نہیں ہو جاتی۔ بھاڑ میں جاؤ۔

عمرانہ کا خط تھا۔ اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا خط۔

PDF Compressor Free Version

فون اور میل کی دنیا میں خط جیسی مسرت آگیں شے اس قدر عنقا ہوگئی ہے کہ حیرت پہلے ہوتی ہے، مسرت بعد میں۔ خط لکھنے اور خط پانے کا اپنا ہی الگ لطف تھا۔ ویسے وہ خود کب کسی کو خط لکھتی تھی۔ اٹھایا فون، بات کرلی، اس نے خط اٹھا کر پرس میں رکھ لیا اور رات کو سارے کام ختم کرنے کے بعد اطمینان سے بستر میں لیٹ کر بیڈ سائیڈ لیمپ جلایا اور لفافہ یوں چاک کیا جیسے کوئی بچہ کسی چاکلیٹ کا ریپر اتار رہا ہو۔ پہلا ہی جملہ تھا۔ ''انوراگ اور میں الگ ہوگئے ہیں۔ بغیر کسی تلخی کے ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ یہ رشتہ چلنے والا نہیں۔''

رضوانہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور تیزی سے آگے پڑھنے لگی۔ ''بہت دنوں سے ہمارے درمیان دوریاں بڑھ رہی تھیں۔ باقی ساری زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ مناسب نہ ہوتا۔ دل اداس تو ہے، لیکن ایسا نہیں کہ دواؤں کا سہارا لینا پڑے یا کسی کاؤنسلر کے پاس جانے کی سوچنے لگوں۔ تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ پتہ نہیں دلچسپ ہے کہ تلخ، تلخ ہے کہ مضحکہ خیز۔ پتہ ہے پہلی بار دل میں اس کا احترام کم ہونے کا احساس کب ہوا؟ دوستوں کے درمیان گپ شپ کے دوران اس نے کہا ''عورتیں صرف دو زمروں میں رکھی جاسکتی ہیں۔ G.I.B. اور not so G.I.B. میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ کیا مطلب؟ کہنے لگا، گدھی ہو تم۔ مطلب یہ کہ good in bed and not so good in bed۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا اس تقسیم میں ماں، بہنیں، خالہ، چچی، پھوپی، دادی، نانی سب کو سمیٹ رہے ہو کیا؟ بڑے اطمینان سے بولا جو میرے لئے ان رشتوں میں آتی ہیں وہ کسی نہ کسی کے بستر میں ہیں یا رہی ہیں۔ یہ تو ایک biological حقیقت ہے۔ پھر وہ مجھ سے ناراض بھی ہوگیا کہ اس وقت وہ اتنے اچھے موڈ میں اتنی مزے مزے کی باتیں کر کے قہقہے لگا رہا تھا اور میں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔ ستیاناس اس لئے نہیں کہ میں نے اس کی ماں، بہن، دادی، نانی کو درمیان میں گھسیٹ لیا بلکہ اس لئے کہ میں نے اسے گھٹیا قرار دیا۔ سچ کہوں رضوانہ میں نے گھٹیا لفظ تو استعمال بھی نہیں کیا تھا جب کہ بعد میں میرے ذہن نے اس کی گردان شروع کردی تھی۔ میں انوراگ کو بہت باذوق اور نفیس سمجھتی تھی۔ آفس میں کئی مرتبہ میں نے مرد ہم کاروں کو عورتوں کے حوالے سے اس سے کہیں زیادہ گھٹیا باتیں کرتے سنا ہے، لیکن انوراگ کہیں بہت اونچے ستون پر تھا۔

اچھا تمہاری بوریت رفع کرنے کو بتادوں کہ میں شادی کے لئے تیار ہوں اور مما سے کہہ دیا ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھے تو مل لوں گی بقول ان کے لاتیں نہیں جھاڑوں گی، مگر ہاں شادی کو جب ہی رضامند ہوں گی جب مجھے بھی وہ اچھا لگے اور میرا virginity test نہ کرائے۔ زیادہ تو نہیں، لیکن کبھی کبھی "Anurag and I had been physical"

''کم بخت، یہ بوریت رفع کی ہے یا زور کا جھٹکا دیا ہے۔ اسے ایمانداری اور صاف دلی کہوں یا حرماں نصیبی۔ سارے اصول گھول کر پی جانا، ساری قدریں طاق پر رکھ دینا کیا معنی رکھتا ہے، کیا آزادی یہی ہے؟'' رضوانہ نے دل میں سوچا۔

''بے ہودہ کہیں کی۔ کم از کم خاموش ہی رہتی۔''

پھر اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

''وہ تمہارے اکرم فاروقی تو نہایت Bond نکلے اور ان سے زیادہ تم کہ کہتی ہو ان کی بارات میں جاؤ گی۔

آج کی تازہ خبر دیکھ لی ہوگی۔ ملالہ پر حملہ کرنے والوں کو کلین چٹ مل گئی۔ ہم لوگ ہاشم پورہ کو رو رہے تھے۔ پھر اروناشان باغ۔ قسم خدا کی رضوانہ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ زنا بالجبر وہ بھی اس طرح کا جیسا اروناکے ساتھ ہوا یا نربھیا کے ساتھ یا بدایوں والی بہنوں کے ساتھ، اس کی سزا اسلامی شریعت میں ہی ہے۔ تمہارے قانون نے تو کہہ دیا کہ اس سوہن لال والمیک کا اب کچھ نہیں ہوسکتا اور اب کچھ ہو کے بھی کیا ہوگا۔ اسے پھانسی دے کر بھی کیا کرلیں گے لوگ۔ میرا خون کھولتا ہے رضوانہ۔ ایک impotent rage مجھے پاگل بنانے لگتا ہے۔ ختم کرتی ہوں۔ میرا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ سارا موڈ غارت ہوگیا۔ سوچا تھا اور کچھ لکھوں گی۔ بہت سا پیار.....عمو

رضوانہ نے بھی جواب میں ہاتھ سے خط لکھا اور اسپیڈ پوسٹ سے بھجوادیا۔

''عمو! ابھی سماج بین المذہبی شادیوں کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہو رہی ہیں، لیکن مڈل کلاس کے والدین تباہ ہوجاتے ہیں، خاص طور پر لڑکی کے والدین۔ تیرے اور انوراگ کے تعلقات کو لے کر تو میرا

PDF Compressor Free Version

بھی پریشان ہونے لگی تھی اوپر سے جتنا مسخرہ پن کر لیتی، لیکن انیس چاچا اور قمر چاچی کی بڑی فکر تھی اسے۔ چل اچھا ہوا تو ایک جھمیلے سے تو بچ گئی، لیکن جہاں تک آگے بڑھ گئی تھی وہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ میں تجھ سے صرف سال بھر بڑی ہوں، مساوات کی زبردست قائل ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے تو انوراگ سے بھی کوئی پرابلم نہ ہوتا، لیکن ہاں یہ جسم کی بات۔ میں اصولوں کی قائل ہوں، کچھ بندشیں ہیں جنھوں نے ہمیں انسان بنایا ہے ورنہ حیاتیاتی طور پر تو ہم بھی ہیں تو جانور ہی۔ اب ایک بات سن لے کان کھول کے اور ہوش میں رہ۔ مجھ سے کہا سو کہا اور کسی سے نہ کہنا اور اگر واقعی اچھا لڑکا مل جائے تو اس سے ہرگز نہ بتانا ورنہ بھاری پڑ جائے گا۔

ملالہ والی نیوز پڑھی۔ (تو تو اسی پروفیشن میں ہے) شاید گزشتہ اکتوبر یا نومبر میں ایک خبر کسی نے دوبئی سے مجھے میل کی تھی وہ بھی یاد ہوگی۔ پاکستان کے کسی شہر میں ایک صاحبزادے نے تیس سال کے بعد اپنی ماں کو ڈھونڈ کے نکالا جنھوں نے اس لڑکے کے باپ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ اب نئے شوہر کے ساتھ ان کے تین چار بچے بھی تھے۔ سب کو چچا کی مدد سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ غریب گھر سے بھاگی بھی نہیں تھی، اس نے تو بیوگی کے بعد دوبارہ گھر بسایا تھا۔ سچ کہوں مجھے اودھم سنگھ یاد آ گیا جس نے بیس برس بعد جنرل ڈائر کو مارا تھا۔ اس عورت کا قصور اتنا ہی بھیانک تھا جتنا جلیاں والا باغ کا قتل عام۔ میں دیر تک انگشت بدنداں رہی۔ رہی شریعت والی سزا تو مستحقین کے ساتھ کئی بے گناہ پس جاتے ہیں، وہ بھی زیادہ تر عورتیں۔ میں خوفناک قوانین کی قائل نہیں ہوں۔ چل، ممی سے کہہ دے مجھے چھوڑیں، تیرے لئے کسی کو لائیں پکڑ کے۔ all the best اور ہاں۔ میں بھی ٹرائی کروں گی۔ اپنے لئے نہیں ایڈیٹ، تیرے لئے۔"

سلمان سے عمو کی ملاقات رضوانہ نے ممبئی میں بیٹھے بیٹھے کرادی۔ وہ جب وکالت پڑھ رہی تھی، سلمان اس سے ایک سال سینئر تھا اور اس کا اچھا دوست تھا، دونوں نے دوستی کے علاوہ کبھی کچھ اور نہیں سوچا۔ مذاق مذاق میں ایک بار اس نے کہا تھا کہ عورتیں ویسے ہی کٹ حجت ہوتی ہیں، وکیل بن جائیں تو کڑوا کریلا نیم پہ چڑھتا ہے۔ وہ شادی کسی پروفیشنل سے تو کرنا چاہے گا، لیکن وکیل سے نہیں۔ فی الحال دہلی ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہا تھا۔ فیس بک کے ذریعے رضوانہ سے رابطہ تھا۔ رضوانہ کو عمو کے لئے اس کا خیال آیا۔ وہ بھی دہلی میں ہی تھی۔ اکثر نیوز کے لئے ہائی کورٹ کے چکر بھی لگا آتی تھی۔

رضوانہ نے اسے فون کیا:

"کیوں بے، شادی کیوں نہیں کر رہا۔"

"تم کیوں نہیں کر رہیں؟"

"سوال میں نے کیا ہے۔"

"ابھی تک وہ نہیں ملی جس سے شادی کرنا چاہوں۔"

"میری بہن کو دیکھے گا؟"

"وہی جو جرنلسٹ ہے اور ایک اخبار میں کام کر رہی ہے۔"

"وہی۔"

"شاید ایک بار اس سے ملا ہوں۔"

"پھر سے مل لے اور ذرا شرافت سے۔ ملنے کا انتظام میں کراتی ہوں۔"

بندہ ہے اسمارٹ۔ عمرانہ نے سوچا۔

"لڑکی اچھی ہے اور بڑی بہن جیسی بقراط بھی نہیں۔"

سلمان نے سوچا۔

"شادی کیوں نہیں کی اب تک؟ خاصے eligible بیچلر ہیں۔"

"سچ بولوں یا جھوٹ؟"

"وکیل زیادہ تر جھوٹ ہی بولتے ہیں، لیکن میں آپ کی کلائنٹ نہیں ہوں۔ مجھ سے سچ بولئے۔"

"میری زندگی میں ایک لڑکی تھی تین سال اس کے ساتھ ضائع ہو گئے۔ ایک آدھ سال اس رشتے کو مکمل طور پر بھولنے میں لگا۔ اب میں آزاد ہوں اور گھر بسانے کا خواہش مند بھی۔ آپ جو چاہیں ابھی پوچھ لیں۔ میں سچ بولوں گا۔ اس کے بعد یہ چیپٹر بند کر دیا جائے گا۔"

"قربت کتنی تھی؟"

"live-in relation ship۔ ڈیڑھ سال۔"

عمرانہ کے اندر کچھ چھن سے ہوا۔

"رشتہ ٹوٹا کیوں؟"

PDF Compressor Free Version

''بس دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگا۔ وہ کہیں اور دلچسپی لینے لگی۔ اس کے بعد شادی بھی جھٹ سے کر ڈالی۔''

''ایک بات بتایئے۔ اگر میں آپ سے کہوں یا کوئی اور لڑکی کہے کہ اس کا کہیں ایسا کوئی رشتہ تھا تو آپ اسے قبول کریں گے؟''

''اگر وہ اس رشتے سے اسی طرح باہر آ چکی ہے جس طرح میں تو ضرور قبول کر لوں گا۔ میں دوہرے معیار کا قائل نہیں ہوں۔ آخر بیوہ اور طلاق شدہ لڑکیوں سے بھی تو شادی کی جاتی ہے۔''

''انہیں شاید اس لئے قبول کر لیا جاتا ہے کہ ان کے پہلے رشتے کو سماج کی منظوری حاصل تھی۔ میں اپنی مرضی کے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔ میرا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ میں اس کے ساتھ رہی کبھی نہیں، لیکن کچھ کمزور لمحے ہمارے درمیان ضرور آئے۔ I am not a virgin''

وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اٹھ کر عمرانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں آپ کی بیباکی اور حق گوئی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔'' پھر مسکرا کر قرون وسطیٰ کے کسی نائٹ کی طرح گھٹنے ٹیک کر بولا:

"May I?"

عمرانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قدرے توقف کے بعد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"Yes!"

رضوانہ بے حد خوش تھی۔ دونوں بہنوں نے بڑی ہوشیاری سے والدین سے یہ بات چھپالی کہ سلمان ذات کا منیہار تھا۔ بس کوئی دو پشت پہلے اس کے گھر کے لوگ فیروز آباد میں شیشہ گری کرتے تھے۔ دو چار غریب رشتے دار ایسے بھی تھے جن کے گھر کی خواتین سر پر ٹوکرا لے کر چوڑیاں پہنانے نکلتی تھیں، لیکن سلمان کے دادا نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر کے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور بیٹے یعنی سلمان کے والد کو ڈاکٹر بنایا۔

''تم اتنی بڑی بات ہضم کر گئیں، لیکن میری ذات کو لے کر والدین سے جھوٹ بولنا چاہتی ہو۔ ایسا کیوں ہے؟''

اس نے عمرانہ سے پوچھا تھا۔

''سنو سلمان، ایک مرد کہیں منھ مارتا پھرا تھا یہ برداشت کر لیا جائے گا، لیکن وہ 'کم ذات' ہے یہ اشرافیہ میں برداشت نہیں ہوگا۔ ان کے نزدیک اعلیٰ ذات سارے عیب چھپا لیتی ہے۔ ویسے تم کم ذات کم، بدذات زیادہ ہو۔'' رضوانہ نے کہا۔

سلمان مسکرایا ''کتنے شیریں ترے لب کہ رقیب......''

''ارے ارے، اسے تو اردو آتی ہے۔''

عمو نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ تینوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''میرے ہنسنے کی وجہ کچھ اور ہی ہے......'' رضوانہ نے مسرور لہجے میں کہا۔

''بتا ڈالو......'' سلمان نے شرارت سے لب بھینچے۔

میری رشتے کی ایک چچی نے بیٹی کی نسبت طے کی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد سننے میں آیا کہ صاحبزادے کا اپنی کسی ہم جماعت کے ساتھ عشق رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے رشتہ توڑنے کی رائے دی۔ چچی نے جواب دیا ہم نے بیٹی کا رشتہ مرد سے طے کیا ہے کسی سادھو سنت سے نہیں اور اطمینان سے شادی کر دی۔

انہیں چچی نے ایک بہت اچھا، کلاس ون سرکاری افسر کا رشتہ صرف اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ اس لڑکے کے خاندان میں تین پشت پہلے کسی بزرگ نے ایک طوائف سے شادی کر لی تھی۔ وہ بی بی تائب ہو کر بڑی اللہ والی ہوئیں۔ محلے میں ایک مسجد بنوا کے گئیں، مگر ان کے گناہ ان کا پیچھا کرتے رہے۔ کسی 'نجیب الطرفین' نے ان کے یہاں بیٹی نہیں دی۔

سلمان کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

''میں رشتوں میں کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ اگر شادی کے بعد معلوم ہوا تو؟ اور واقعہ یہ ہے کہ معلوم ہو ہی جائے گا۔''

عمرانہ ہنسنے لگی۔ یہاں بھی ایک چچی ہیں۔ ان کا تعلق بہار سے ہے۔ وہ بھوجپوری کی بڑی فصیح و بلیغ مثل سناتی ہیں۔

''بھئیل بیاہ مور، کربا کا۔ یعنی اب تو بیاہ ہو چکا، کر لو کیا کرو گے؟''

بڑی دھوم دھام سے عمو کا بیاہ اس مرد حق گو سے ہوا جسے حق

PDF Compressor Free Version

سننا آتا تھا اور سن کر اسے برداشت کرنا بھی۔

رضوانہ عمو کی شادی کے تیسرے ہی دن واپس ہوگئی۔ اس کا آنا جانا یوں ہی طوفانی ہوا کرتا تھا۔ شادی میں میرا کی ماں اور کزن، جانہوی بھی آئی تھیں۔ دونوں بہنوں کے گلے لگ کر خوب روئیں۔ چھان پھٹک تو لیا ہے نا؟ انہوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے قمر سے پوچھا۔

انیس نے اب رضوانہ سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ چلو ایک بیٹی کا بیاہ کر کے سماج میں سرخرو ہو لئے۔ کچھ دن کے لئے لوگ بھی خاموش ہو جائیں گے۔ وہ خود سر ضدی لڑکی جانے اور اس کا کام، لیکن وہ قمر کے سامنے بڑبڑاتا اکثر رہتا تھا۔ میں عورتوں کے زیادہ پڑھنے کے حق میں کبھی نہیں رہا تھا وغیرہ وغیرہ۔ ایک دن قمر ہنسی: ''تم کیا بڑے بڑے نہیں رہے۔ سرسید احمد خاں جنہوں نے پوری قوم کو اتنی بڑی درسگاہ کا تحفہ دیا، عورتوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے تو صاف صاف کہا کہ عورتوں کو تعلیم ملی تو وہ اپنا حق مانگنے لگیں گی۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''اب تو خوب حاصل کر رہی ہیں تعلیم۔ آپ کون سی کم ہیں۔ آپ ہی کا فیض ہے کہ بیٹیوں نے جو چاہا کیا۔ رہے سرسید یا مولانا تھانویؒ، تو وہ پرانے بزرگ تھے۔ ان کی سوچ اتنی ہی تھی۔''

''آپ کی سوچ کون سی آگے بڑھی۔ آپ پرانے بزرگ کب سے ہو گئے۔''

''لڑنے کے علاوہ تعلیم سے اور کیا کیا آتا ہے؟''

''گھر کی آمدنی میں اضافہ۔ سر اٹھا کے جینا۔ کسی عنوان مرد کا سایہ سر پر نہ ہو تو خود کفیل ہونا۔''

''اور گھر سے دور تنہا رہ کر نہ جانے کیا کیا کرتی پھرنا جو ہماری رضوانہ صاحبہ کر رہی ہیں۔'' اس نے بات کاٹ کر لقمہ دیا۔

''کیا کرتی پھر رہی ہے! کسی نے کچھ کہا کیا؟''

''کوئی کہے گا کیا، لیکن قیاس بھی تو کوئی چیز ہے۔ آخر وہ اکرم فاروقی کیوں بھاگ نکلا۔ اسے تو محترمہ نے پسند کر لیا تھا۔''

اپنی ہی بیٹی کے لئے انیس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور شدید ناپسندیدگی کا عنصر۔

اکرم فاروقی کی شادی کا دعوت نامہ رضوانہ نے سمیر اور نرگس کو بڑھا دیا تھا چونکہ اکرم نے لکھا تھا کہ چاہے تو ساتھ کے لئے ایک دو دوستوں کو مدعو کر سکتی ہے۔ سمیر نے اسے مذاق سمجھا اور توجہ ہی نہیں دی۔ نرگس دوست کے ساتھ ہم کار بھی تھی۔ وہ چلی آئی۔

اکرم حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے لگ رہا تھا رضوانہ نے یونہی کہہ دیا ہے۔ شاید یہ دکھانے کے لئے کہ اسے اکرم کی کہیں اور شادی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ آئے گی تھوڑے ہی۔ بڑی جی دار لڑکی ہے، اس نے سہرے کی لڑیوں کے پیچھے سے اسے غور سے دیکھا اور پھر کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ رضوانہ نے بے حد سلیقے سے میک اپ کیا تھا۔ بے داغ گندمی جلد، شانوں تک تراشے ہوئے کھلے بال۔ کپڑے نہایت باذوق، نہ چیختے چلاتے جیسے اکثر خواتین شادی میں روا رکھتی ہیں، نہ آفس والے کالے سفید، سراپا شاخ گل، پھر ایسی وضع داری کہ کچھ لوگوں کے سوال کرنے پر اس نے بڑی متانت سے بتایا کہ اکرم کی کمپنی اور اس کی لاء فرم کے کاروباری تعلقات کی وجہ سے وہ اور نرگس اپنی فرم کے سربراہ کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

اچانک اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کہیں کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ داغ برس کا داغ تھا تو اب تک پھیل چکا ہوتا۔ جس لڑکی کے گھر وہ بارات لے کر آیا تھا، وہ والدین کی موجودگی میں چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوئی تھی اور بس ایک بار کی اس نہایت روایتی ملاقات کے بعد رشتہ طے پا گیا تھا۔ بیشک اس کے بعد فون پر گفتگو ہوتی رہی تھی، لیکن بس دو ماہ کے اندر شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ لڑکی قبول صورت تھی، گفتگو میں معقول محسوس ہوتی رہی تھی، لیکن یہ 'بات' نہیں تھی اس میں، یہ اعتماد بھی نہیں تھا۔

پھر اس نے دل کو تسلی دی۔ عورتوں میں خود اعتمادی وصف نہیں، منفی پہلو ہو سکتا ہے۔ مہمانوں میں ایک صاحب رضوانہ کے پرانے شناسا نکل آئے تھے۔ شاید لاء کالج میں ساتھ تھے، بڑی گرمجوشی سے ان سے ہاتھ ملایا پھر دیر تک چہک چہک کر باتیں کرتی رہیں۔ کیا پتہ کبھی کوئی 'معاملہ' رہا ہو۔ ایسی آزاد، خود مختار لڑکیاں اتنے دنوں تک کنواری رہ

PDF Compressor Free Version

جائیں اور کوئی معاملہ نہ رہا ہو۔ ناممکن، اوکے، ناممکن نہ سہی، لگ بھگ ناممکن next to impossible۔ اچھا خیر نہ ہو کچھ، لیکن مردوں سے اتنی بے تکلفی برتنے والی خواتین ہمارے گھر میں کہاں کھپیں گی۔ شادی کے بعد ملازمت جاری رکھنے کا ارادہ بھی تھا۔ پتہ چلتا کہ گھر میں مرد دوست چلے آرہے ہیں، یہ لڑکی یقیناً گھریلو مزاج کی ہوگی ہمیشہ والدین کے ساتھ رہی ہے، عمر میں کم ہے۔ کمپیوٹر کا کورس کر چکی ہے۔ اگر گھر میں کچھ زائد، ذاتی آمدنی چاہے گی تو پارٹ ٹائم کام کرنے دوں گا۔ جوں رہا ہے بہت ٹھیک ہے۔ اس نے طمانیت کے ساتھ سوچا اور خوشی خوشی نکاح نامے پر دستخط کر دیے۔

جو ملا وہ بہت ٹھیک نہیں تھا، وقت نے بتایا، وقت جو سب سے بڑا منصف ہے، وقت جو سب سے بڑا مزاج داں ہے، وقت جو زخم بھرتا بھی ہے اور زخم دیتا بھی ہے۔

سال، ڈیڑھ برس کے اندر اکرم فاروقی کی بیوی گھر جا کر بیٹھ گئی۔ بات یہ نہیں تھی کہ اکرم میں کوئی کمی تھی، بات یہ بھی نہیں تھی لڑکی بری تھی یا اپنے مرد دوستوں کو گھر پر بلاتی پھرتی تھی۔ وہ تو سرے سے کریئر گرل تھی بھی نہیں۔

اکرم کو ملازمت پیشہ بیوی پر اعتراض نہیں تھا، ایک خاموش پسندیدگی ہی تھی کہ گھر میں دوہری آمدنی بہتر معیار کی ضامن ہوتی ہے، لیکن نہایت دولتمند سسرال سے اس کی بھرپائی ہو رہی تھی۔ بہ حیثیت مجموعی دونوں شریف گھروں کے عام سے میاں بیوی تھے بس اس لڑکی کا موسیقی سے غیر معمولی شغف اختلافات کی بنا بن گیا، اس نے باقاعدہ کلاسیکی موسیقی کچھ عرصے تک سیکھی بھی تھی، لیکن اس سے کیا، اس کے "بایو ڈاٹا" میں تو اس کا ذکر بھی تھا کہ اسے موسیقی کا شوق ہے۔

تو اس سے یہ کہ ہر کونسرٹ کا ٹکٹ چاہئے، آئے دن ممبئی کے کوڑی پھیرے، ہر وقت موبائل پر یا لیپ ٹاپ پر یوٹیوب پر زور زور سے گانے سنے جا رہے ہیں۔ آواز کم کرنے کو کہو تو مزا نہیں آتا، پھر یہ کہ آن چھوڑ کر اٹھ جانے پر کان میں آواز آتی رہتی ہے اس لئے والیوم کم نہیں ہوگا۔ اماں ابا نے کچھ عرصے بعد میوزک کی تعلیم رکوادی تھی کہ شریف مسلمان گھرانوں میں اس سے زیادہ کا کیا کام، بہت ہوا، شوق پورا کر لیا، ہم تو بھائی یہ سوچ کر بیٹھے تھے کہ شادی کے بعد آزاد ہوں گے۔ آج کے شوہر کو ایسا اعتراض تھوڑی ہوگا۔ سو استاد مقرر کر لئے گئے، اب ہر وقت ریاض ہو رہا ہے۔

بات یہاں تک بھی رہ جاتی تو خون کے گھونٹ پی پی کر برداشت ہو جاتی، جیسے ہو رہی تھی اس لئے کہ باقی معاملوں میں لڑکی اچھی تھی۔ گھر بہت سلیقے کے ساتھ رکھتی، باورچی خانے میں دلچسپی لیتی اور انور اگ کی جس درجہ بندی کی وجہ سے عمرانہ کا جی کھٹا ہوا تھا، اس کے مطابق جی آئی پی تھی۔ گڈ ان بیڈ۔ پانی سر سے اونچا یوں ہوا کہ جو صاحب میوزک سکھانے آتے تھے انہوں نے اسٹیج پر پروگرام دینے کے خواب جگائے اکرم نے سخت نارضامندی کا اظہار کیا تو انہوں نے بہت دیر بیٹھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھئے رومی (وہ ادھیڑ عمر انسان تھے، اس کی عرفیت استعمال کرنے لگے تھے) میں بڑی ٹیلنٹ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر وہ کوشش جاری رکھے تو پلے بیک سنگر تک بن سکتی ہے۔ آپ اس کی صلاحیت کو دبایئے مت۔ ہر انسان اپنی تکمیل چاہتا ہے۔"

انہوں نے دو چار نفسیات دانوں کو کوٹ کیا۔ اکرم مزید بھڑکا، یہ اس کے گھر کا معاملہ تھا۔ بیوی بھی اُلار ہو گئی۔

"جس کو کھرچو اس کے اندر سے ایک فیمنسٹ برآمد ہو رہی ہے۔" ایک دن وہ چڑھ کر بولا تھا۔

"کس کس کو کھرچ چکے ہیں آپ؟"

تیز اب میں ڈوبا جوابی حملہ ہوا۔

رومی گھر سے بے نیاز ہوتی چلی گئی، پھر اکرم سے بھی، اس نے اسٹیج پر پروگرام تو نہیں دیا، لیکن صبح کا وقت جو پہلے ساتھ میں بڑا خوبصورت گزرا کرتا تھا، ریاض میں گزرتا تھا۔ اکرم کو کلاسیکی موسیقی سے کوئی شغف نہیں تھا۔ وہ اسے چیخ پکار لگتی (جیسے راج کے دوران بعض انگریزوں کو لگا کرتی تھی۔) اب اکرم بیڈ ٹی تنہا پیتا تھا۔ اکثر ناشتہ تنہا کرتا تھا۔ اس نے میوزک ٹیچر کو ہٹانے کی بات کی تو وہ میکے چل دی۔ یہ سارا معاملہ شادی کے چھ ماہ بعد شروع ہو کر اگلے سال بھر کے اندر سنگین صورت اختیار کر چلا۔ آئے

PDF Compressor Free Version

دن جھگڑے، آئے دن بات چیت بند، اخراجات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ بڑے گھر کی لڑکی کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا، شروع میں اس کے پاس بھاری رقم تھی جو اسے شادی کے وقت ملی تھی، لیکن اب وہ ہر چیز کے لئے اکرم سے فرمائش کرتی تھی۔ غرض یہ کہ ایک بنیادی اختلاف نے بہت سے چھوٹے چھوٹے اختلافات کی راہیں بھی کھول دی تھیں جو آگ میں گھی ڈالتے رہتے تھے۔

پہلے میں نے سوچا ہمارے یہاں جلدی ایک بچہ آجائے تو بیوی اس میں بندھ کر میوزک بھول جائے گی۔ پھر میں نے سوچا کہ نہیں ابھی بچہ مزید مسئلے پیدا کر سکتا ہے، پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ یہ شادی چل سکے گی یا نہیں۔ بیوی نے بچے کی خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ بھی شک ہوا کہ کہیں وہ اچھی ماں ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔ ابھی اس کی عمر کم ہے۔ کسی دن باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ اسے شادی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بڑے رومانی تصور پال رکھے تھے اس نے۔ میں نے پوچھا کہ پھر تم راضی کیوں ہوئیں۔ بولی میں نے سوچا یہ بھی ایک تجربہ ہے، کر لیا جائے۔ تو؟ جواب ملا I am sorry, it doesn't seem working۔ ویسے کوشش تو کر رہی ہوں۔

اکرم نے یہ ساری باتیں اختصار کے ساتھ، لیکن صاف صاف لکھ ڈالی تھیں۔

کوئی اٹھارہ بیس ماہ کے وقفے کے بعد جب وہ کبھی دھندلی سی یاد بن کر بھی شاید ہی ابھرا ہو، اس کا نام میل باکس میں دیکھ کر رضوانہ کی آنکھیں ہر مرتبہ سے زیادہ حیرت زدہ ہوا تھیں۔ ڈھیٹ کہیں کا۔ اب کیا بچے کی چھٹی میں مدعو کر رہا ہے۔

سارا کچھ پڑھ کر اس نے جواب دیا: ''آپ مجھ سے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں۔''

جواب کا جواب آیا۔ ''ملنا چاہتا ہوں۔''

رضوانہ نے لکھا۔ ''میں طلاق میں اسپیشلائز نہیں کرتی۔ نہ ہی میرج کاؤنسلر ہوں۔ آپ غلط بٹن دبا رہے ہیں۔''

اکرم نے اب کی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح رضوانہ کے پاس پہنچ گیا جیسے ڈھائی تین سال پہلے پہنچا تھا۔

''میں، آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے آیا ہوں۔ اگر آپ رضامند ہوں تو ابھی آپ کے سامنے طلاق نامہ لکھ کر سسرال بھجوا دوں گا۔''

رضوانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''مجھے دروازے پر آئے لوگوں کو بے عزت کرنا اچھا نہیں لگتا اکرم فاروقی صاحب۔ آپ کا چہرہ میں آج آخری مرتبہ دیکھوں۔ آج کے بعد آپ نظر نہ آئیں، جو یاد اللہ آپ سے ہوئی اس کے تحت ایک مشورہ ضرور دوں گی، جایئے کسی میرج کاؤنسلر سے ملئے۔ یہ ایڈجسٹمنٹ کے معمولی مسئلے ہیں۔ بیوی کپڑوں کی طرح نہیں بدلی جاتی۔''

''یہ آپ کا آخری جواب ہے؟''

رضوانہ نے کچھ فائلیں اٹھائیں اور چیمبر سے باہر نکل گئی۔ کوری ڈور میں بیٹھے چپراسی سے کہتی گئی، میرے کیبن میں جو صاحب ہیں ان سے کہو تشریف لے جائیں۔

نرگس اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ کر تجربہ کر رہی تھی کہ شادی کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ جو ہی نے دو چار عشق لڑا کر ماں باپ کی پسند سے شادی کر کے ائر لائنس کی نوکری چھوڑ دی تھی اس لئے کہ اس کے شوہر اور سسرال والوں کو ائر ہوسٹس کی نوکری پسند نہیں تھی۔

''مجھے فیشن ڈیزائننگ کا شوق رہا ہے۔'' اس نے رضوانہ کو شادی کا کارڈ دیتے ہوئے بتایا تھا۔

''بہ آسانی کوئی کورس کر کے اپنا بوتیک کھولوں گی۔ ائر ہوسٹس کی نوکری چھوڑنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ خوب انجوائے کر چکی ہوں، مگر ہاں کچھ تو کروں گی۔ شوہر کے آگے ہاتھ پھیلانا مجھے پسند نہیں۔'' قدرے توقف کے بعد بولی:

''نوکری اس لئے چھوڑ دی کہ میں خود اب اکتا چکی تھی ورنہ میں شرطیں مان کر شادی کرنے والی نہیں ہوں۔ آنا ضرور، اس نے خوش دلی سے کہا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔''

''کرایہ دے گی ہوائی جہاز کا؟ ٹرین کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔'' رضوانہ نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

PDF Compressor Free Version

''دوں گی۔'' وہ پیکنگ میں مصروف ہوگئی۔ ایک دن پہلے ممبئی کی ساری شاپنگ رضوانہ کو دکھا چکی تھی۔ راجستھان میں گوٹے کا کام بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ ممی نے بھاری لہنگا بنوایا ہے اور کئی شفان کی ساریوں پر بھی گوٹے کا کام بنوایا ہے، اس نے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔ میرا بھی ایسی ہی خوش خوش شاپنگ کرتی پھر رہی تھی۔

رضوانہ نے اداس ہوکر سوچا۔ اس کی اداسی اس کے چہرے پر کھنڈ آئی۔ عورتیں کب کپڑوں، زیورات اور میک اپ سے اوپر اٹھ سکیں گی، لیکن اگر ساری کی ساری عورتیں ان سے بے نیاز ہوجائیں تو کائنات سے رنگ نہیں اڑ جائیں گے؟ کیا خوبصورت کپڑے پہننے اور خوشنما نظر آنے میں کوئی برائی ہے؟ قطعی نہیں، اس نے سوچا بشرطیکہ زندگی صرف ان سے عبارت نہ ہوجائے اور کوئی مرد یہ نہ کہہ سکے کہ نہیں اور کام کیا ہے۔ گہنے تڑواؤ، گہنے بنواؤ۔

عمو اپنے گھر میں خوش تھی، اس کے یہاں جڑواں بچے ہوئے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ سلمان بے حد خوش تھا۔ دقت تو ہوگی، لیکن ساتھ ساتھ پل جائیں گے۔ پھر یہ کہ بیٹا، بیٹی دونوں۔ اتفاق سے عمو کی زچگی اور جوہی کی شادی کا وقت ایک ہی تھا۔

رضوانہ جے پور میں بس ایک دن رک کر دہلی چلی آئی۔ عمو کا روشن چہرہ دیکھ کر اسے پہلی بار زندگی میں کسی کمی کا احساس ہوا۔ نرگس کی بات یاد آئی۔ جس دن بچے گملوں میں اگنے لگیں گے اس دن عورتیں ہمسری کا دعویٰ خم ٹھوک کر کرسکیں گی۔ فی الحال تو تھوڑا سا جھکنا پڑے گا۔ اس نے بچوں کو گود میں اٹھایا تو اسے محسوس ہوا اس کی چھاتیوں میں سرسراہٹ ہورہی ہے۔ کچھ دودھ اترنے جیسی سرسراہٹ، میں نارمل ہوں، میں نارمل ہوں۔ ذہن نے گردان کی، لیکن میں جس ذہنی، سماجی اور جذباتی سطح پر ہوں، وہاں کسی شخص کو صرف اس لئے قبول نہیں کرسکتی کہ مجھے ایک شوہر چاہئے، میں اپنی اس خواہش کے ساتھ بھی نارمل ہوں کہ مجھے اس سے مل کر ذہنی ہم آہنگی کا احساس ہو تبھی میں اسے قبول کرسکوں۔

اسے سمیر کا خیال آیا، وہ بہترین دوست تھا، ہر مسئلے میں سہارا، ہر پریشانی میں دوڑ پڑنے والا، اس نے کبھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا، لیکن رضوانہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو کسی طرح راضی کرکے پرانا فلیٹ بکوادیا اور دوسرا ایسے علاقے میں خریدا جو رضوانہ کے علاقے سے قریب تھا، ورنہ ممبئی کے فاصلے الامان، اکثر آنکتا تھا، میں اس کے ساتھ پوری زندگی آرام سے گزار سکتی تھی، لیکن راہ کے پتھروں کو کیا کروں۔ دنیا کہے گی بیٹی کو چھوڑ دیا تھا، کیا کرتی، جو ملا اس سے شادی کرلی۔ (جو ملے اس سے پکڑ کر شادی کردینے والے والدین کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔) بے چارے، بے قصور مورد الزام ٹھہرائے جائیں گے۔ بچوں کے لئے مذہب کا جھمیلا ہوجاتا ہے۔ لوگ پہلے سوچتے نہیں، بعد میں چپقلش سارے رومانس پر پانی پھیر دیتی ہے۔ شاید سمیر اور میں اس چپقلش سے اوپر اٹھ جائیں۔ ہم دونوں پختہ عمر، پختہ ذہن ہیں۔ چھوڑ دیں گے بچوں کو یونہی۔ بڑے ہوں گے تو جو چاہیں لیبل لگائیں اپنے اوپر۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔ محض دوست رہ کر تو ساری زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ نرگس کی طرح ساتھ رہنے لگوں؟ وہ پارسن مسلمان کے ساتھ آرام سے رہ رہی ہے۔ آخری شادی کے دو بول پڑھوا کے یا پھیرے لے کے ہوتا کیا ہے؟ لیکن تب ہاں اگر میرے اندر کی عورت جاگ کر ماں بننا چاہے تو؟ دو بول ان بچوں کو جائز بناتے ہیں۔ اتنا تو کرتے ہیں ورنہ امرتا پریتم اور امدر جیت کو لے لو۔ کس قانونی شادی سے کمتر رشتہ تھا ان کا۔ اس کا سر دکھنے لگا، واقعی میں اولڈ میڈ بنتی جارہی ہوں۔ اچھا تھوڑا اور سوچ لوں اور ممی سے بات کرکے دیکھوں، کیا ری ایکشن ہوتا ہے۔

ممبئی واپس آکر اس نے سب سے پہلے سمیر کو فون کیا۔

''ہائی، آئی ایم بیک۔''

''اوہ رضوانہ، میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ یار، اماں میرا رشتہ طے کرآئی ہیں۔'' اس کی آواز قدرے کھسیائی ہوئی تھی۔

تو خوش ہوکے بتاؤ نا، مرے کیوں جارہے ہو، رضوانہ کو اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی، بے حد کھوکھلی، اس نے کبھی سمیر کے ساتھ بات کرتے ہوئے خود کو یوں دوغلا نہیں محسوس کیا تھا۔

رضوانہ اکرم فاروقی کی بارات میں شریک ہوئی تھی، سمیر کی تو ساری رسموں میں شریک ہوئی۔ الٹی سیدھی ڈھولک بجاکے بے سری آواز میں گیت بھی گائے۔ سمیر کو جب دولہا بنایا جارہا تھا تو بے حد مسرور

PDF Compressor Free Version

آواز میں ہنسی مذاق بھی کرتی جارہی تھی، لیکن اس کی گہری سیاہ اداس آنکھیں بالکل الگ کھڑی تھیں۔

سمیر نے ہولے سے کہا: ''میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔''

''مجھے کوئی شکایت نہیں۔'' اس نے جواب دیا، لیکن الفاظ ٹھن ٹھن بجے، ایسے خالی جیسے اس کا دل۔

آفس کی مصروفیتیں خالی دل بھرتی تو رہیں، لیکن کہیں رات کو وہ پھر خالی ہو جاتا تھا اور نیند جلدی نہیں آتی تھی۔ پھر ایک دن قمر کا فون آیا۔ یہی آفس کے اوقات میں۔

مما اب کیا؟ اس نے سوچا، لیکن فون ریسیو کرتے ہوئے اس کے ہاتھ قدرے کانپے۔

''تمہارے پاپا پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔'' قمر نے خشک آواز میں کہا اور فون رکھ دیا۔

انیس کے جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا اور گویائی جاتی رہی تھی۔ باقی سارے احساسات باقی تھے۔ رضوانہ سامنے آئی تو اس نے منہ پھیر لیا۔ قمر نے کہا سامنے مت جاؤ، بول تو سکتے نہیں، گونگا غصہ اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے کیا کیا ہے مما؟ لیکن الفاظ اس کے منہ سے باہر نہیں آئے۔ وہ بھی پل بھر کو گونگی ہو گئی جیسے اس پر بھی فالج نے حملہ کیا ہو۔ پھر آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اس پرائیویٹ نرسنگ ہوم کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھی روتی رہی۔

رضوانہ نے چھٹی بڑھائی۔ ذاتی فلیٹ بک کرانے والی تھی، لیکن وہ پیسہ ماں کے اکاؤنٹ میں ڈال کر انیس کو زیادہ مہنگے نرسنگ ہوم میں شفٹ کرایا۔ ڈاکٹروں نے کہا بھی کہ دوائیں وہی دی جائیں گی چاہے کہیں لے جائیے، لیکن یہاں نرسنگ زیادہ اچھی تھی۔ اٹنڈنٹ کے لئے بھی سہولیات زیادہ تھیں۔

انیس آئی سی یو سے باہر آ گیا اور کمرے میں منتقل ہوا تو رضوانہ واپس چلی گئی، چلتے ہوئے اس نے شیشے کے چوکور حصے سے باپ پر نظر ڈالی۔ اتفاق سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ اس نے انتہائی غصے میں سر پیٹنا شروع کیا اور پھر رونے لگا۔ یہ رونا کسی جدائی کے غم میں نہیں تھا بلکہ اس سے بے بسی کے احساس کے تحت تھا کہ وہ نہ بول سکتا ہے نہ اُٹھ کر بیٹی کو دھکا دے کر ہسپتال سے باہر نکال سکتا ہے۔

''جارہی ہے، جارہی ہے، واپس جارہی ہے۔''

قمر نے شوہر کو تسلی دی، انیس نے بائیں ہاتھ سے دفع ہونے جیسا اشارہ کیا اور پھر اسی ہاتھ سے آنسو پونچھے۔

دل کا درد بڑھ گیا تھا۔ پاپا میں نے کیا برا کیا؟ کیا مجھے اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں ہے؟ آپ اپنی مرضی سے جیئے، آخر کو آپ نے مما سے ان کی ایک ایک ایکٹویٹی چھڑوا ہی دی جو رٹائرمنٹ کے بعد ان کو مصروف رکھنے کا بڑا سہارا ہوتی۔ شاید کبھی ان کی انجمن کے ذریعے لوگوں کا بھلا کرنے کی کوششیں کامیاب بھی ہوتیں۔ آخر ان کے چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد دو لڑکیاں بردہ فروشوں کے چنگل سے رہا کرائی گئی تھیں۔ ایک طلاق یافتہ لڑکی کو عدالت کے ذریعہ گزارہ بھتہ دلوایا گیا۔ چراغ جلتا ہے تو کچھ دور تو روشنی ہوتی ہی ہے۔ انہوں نے بوتیک کھولنا چاہا تو آپ نے کہا درزی گیری ہمارے خاندان کا پیشہ نہیں ہے۔ میری اور تمہاری پنشن کافی سے زیادہ ہے۔ ہوس کیوں ہو گئی ہے تمہیں۔ پاپا ہر کام ہمیشہ ہوس کے لئے نہیں کیا جاتا۔ زندگی کچھ مصروفیت چاہتی ہے۔ وقت گزاری کا ذریعہ چاہتی ہے، کچھ کر پانے کی طمانیت چاہتی ہے۔ ہاں اب تو آپ نے مما کو وہ مہیا کرا دی۔ پڑے رہئے بستر میں۔ ان کا وقت آپ کی دیکھ بھال میں گزرے گا، کہیں جو وہ آپ سے پہلے چلی گئیں تو ذرا اس کا خیال کر لیں، پھر تو میرے پاس ہی آئیے گا۔ عمو کے بچے ہیں، شوہر ہے۔ وہ اتنا وقت نہیں دے پائے گی۔

بھاری دل کے ساتھ باپ کو دور سے دیکھ کر وہ لوٹ آئی۔

انیس کو نرسنگ ہوم نے ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا تھا۔ اب وہاں وہ صاحب فراش تھا۔ رضوانہ نے اس کے لئے ایک مردنرس کا انتظام کر دیا تھا اور اخراجات اپنے ذمہ لے لئے تھے گرچہ کوئی مالی دشواری گھر پر نہیں تھی۔

عمو بھی کچھ دن رہ کر لوٹ گئی۔ شروع میں اور بہت سے عزیز رشتہ دار آئے۔ پھر سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہوئے۔

PDF Compressor Free Version

ایک خاموش اداس ماحول میں قمر اور انیس کی زندگی لگے بندھے ڈھرے پر گزرنے لگی۔ وہ اداسی لکھنؤ سے اٹھ کر آتی، ممبئی میں رضوانہ کے فلیٹ کی کھڑکیوں سے جھانکتی، کچھ دیر ٹھہرتی پھر دوبارہ لوٹ آنے کے لئے کہیں گم ہو جاتی تھی۔ کبھی نیند کے دھندلکوں میں، کبھی کام کے ڈھیر میں، کبھی کچھ زبردستی چھینے گئے تفریح کے لمحوں میں، مگر وہ کبھی مرتی نہیں تھی کہ اسے بقائے دوام حاصل تھی۔ وہ شاخسانہ تھی اپنی راہیں خود متعین کرنے کا، وہ قیمت تھی سماج کے ڈر سے کچھ راہوں کو مسدود کر دینے کا۔ اس لئے وہ دروازے پر دستک دیتی رہتی تھی اور ایک روسی لوک کتھا کی چڑیل کی طرح دھکا دے کر نکالے جانے کے باوجود دوسرے دن شام ڈھلے پھر آن موجود ہوتی تھی۔

سمیر سے بات کم ہی ہوتی تھی۔ ملنا جلنا تو برائے نام رہ گیا تھا، دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھ رہے تھے کہ اب پہلی جیسی بات نہیں رہ سکتی۔ شاید کہیں یہ ڈر تھا کہ سمیر کی بیوی کو شک ہو جائے گا، یا پھر یہ ڈر تھا کہ زخموں پر کبھی کھرنڈ آ ہی نہیں سکیں گے۔ کہیں کسی قسم کا پیچیدہ رشتہ نہ بن جائے، جس پودے نے سر اٹھا لیا تھا وہ تناور درخت کی صورت نہ اختیار کر لے جسے اکھاڑ پھینکنا ممکن ہی نہ ہو۔ (لیکن کیا وہ صرف پودا تھا؟ کیا اسے اکھاڑتے اکھاڑتے وہ تھک نہیں چکی تھی؟ کیا سنگلاخ دل کی زمین سے لہو نہیں پھوٹ بہا تھا؟)

اس نے سمیر کو پاپا کے صاحب فراش ہو جانے کی اطلاع نہیں دی کہ دکھ بانٹ سکے۔ پہلے وہ نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے لئے اس کی طرف دوڑ جایا کرتی تھی۔ جو ہی کے جانے کے بعد فلیٹ کے لئے کسی شرکت دار کی تلاش، فلیٹ خریدنے کا پیسہ جمع ہوا تو بساط کے مطابق علاقہ اور فلیٹ دیکھنے کی بات، بینک سے لئے جانے والے قرض پر گفتگو کر لینے کی بات، اکرم فاروقی مظہر نامے پر لکھا گیا تو اسے پڑھنے کی بات، یہ سارے مسئلے بہت چھوٹے تھے، وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، خود مختار، خود کفیل نوجوان عورت تھی۔ آج کی عورت، لیکن کسی کے ساتھ، کسی کے قرب کا وہ طمانیت بخش احساس، وہ ایک شخص جس سے وہ اماں یار اور ابے تبے کر کے بات کر لیتی تھی۔

''الو کے پٹھے ہو تم.....'' ایک بار تو وہ یہ تک بول گئی تھی۔ وہ چونکا تھا، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ہنس پڑا تھا۔

''یہ legal language ہے کیا؟ اگر میں نے تمہیں پرپوز کیا تو اس میں الو کا پٹھا ہونے کی کیا بات ہے؟''

''اس لئے کہ تمہاری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ آئی ایم ناٹ ان لو وِد یو۔ تم گہرے دوست ہو، تمہیں پسند کرتی ہوں اور بس۔''

اس نے کس طرح تھپک تھپک کر اپنے دل کو سلا رکھا تھا، کن کن الفاظ کے تلے اس ایک لفظ کو دبا دیا تھا جسے محبت کہتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ سماج نے اسے حق نہیں دیا تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرے جس کے ساتھ اسے ہمیشہ خوش رہنے کی امید تھی۔

اس نے کچھ حق ضرور چھینے تھے، لیکن ان کے آگے لکیر بھی کھینچی تھی کہ اب بس۔ گرچہ دل تو اور بہت کچھ مانگتا تھا، جن لوگوں کے لئے اس کے سماج نے، اس کو ورثے میں ملی اخلاقی قدروں نے کچھ فرائض تفویض کئے تھے ان سے اس نے پہلو تہی نہیں کی تھی، لیکن بدلے میں اسے کیا ملا؟ یہی کہ اس کے باپ نے اسے دیکھ کر نفرت سے منھ پھیر لیا وہ بھی ایسے وقت جب وہ اس کے پاس بیٹھ کر، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہنا چاہ رہی تھی۔ ''پاپا میں ہوں نا، میں آپ کی بیٹی، آپ کی غم گسار۔''

عمو سے اس کی اگلی ملاقات چھ ماہ بعد انیس کے انتقال کے موقعے پر ہوئی، اس کی موت اتنی اچانک تھی کہ دونوں بیٹیوں میں سے کوئی بھی آخری وقت میں نہیں پہونچ سکا تھا۔ صرف قمر تھی جو قالین پر اس کی پٹی پکڑے بیٹھی کسی کتاب سے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔

سیوم کے بعد دونوں بہنوں نے ماں سے کہا کہ وہ ان میں سے جس کے ساتھ چاہے رہ سکتی ہے یا باری باری دونوں کے درمیان وقت تقسیم کر سکتی ہے۔ قمر نے سختی سے انکار کر دیا۔

''میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور میں نے ابھی ساٹھ کی دہائی پار ہی کی ہے۔ لکھنؤ میرا شہر ہے اور یہ میرا گھر ہے، میں یہاں خوش ہوں اور یہاں تنہا بھی نہیں ہوں۔ زندگی نے ایسی پختگی دی کہ گزر نہ

PDF Compressor Free Version

کرسکوں تب دیکھا جائے گا۔" اس کے لہجے میں سفاکانہ قطعیت تھی۔

لڑکیاں واپس ہوگئیں۔

عدت پوری ہونے کے بعد قمر نے انجمن نسواں پھر سے جوائن کرلی۔ کچھ عرصے بعد گھر ہی میں ایک چھوٹا سا بوتیک بھی کھول لیا۔ انجمن کی سرگرمیاں جزوقتی تھیں۔

"میں اب کسی کی پابند نہیں، کسی کو جوابدہ نہیں، صرف اپنے ضمیر کی جوابدہ ہوں اس لئے ایسا کوئی کام نہ کبھی کیا نہ اب کروں گی جو میرے ضمیر پر بوجھ ہو۔" ایک دن عمو سے فون پر بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ایک بار عمو کے یہاں جا کر رہ بھی آئی تھی، اس کے بچوں سے اسے بے حد محبت تھی جو دن بدن زیادہ پیارے، زیادہ دلچسپ ہوتے جارہے تھے۔ عمرانہ کی مطمئن و مسرور زندگی قمر کی بہت سی اپنی محرومیوں کی تلافی کرتی محسوس ہوتی تھی۔ (اس کو انیس کے ساتھ اپنے گھر بسا دیکھ کر اور اولادیں ہوجانے پر اماں بھی ایسا ہی کچھ محسوس کرتی تھیں۔ ان کا چہرہ ان کے جذبات کا آئینہ ہوا کرتا تھا۔)

انیس کے انتقال کو سال بھر ہو چکا تھا۔

"آج مرے کل دوسرا دن" رضوانہ نے بے حد اداس ہوکر کہا۔ بہت سے محاورے زندگی میں بڑی دیر سے سمجھ میں آتے ہیں۔

"ابھی نہ جانے کتنے اور سمجھ میں آنے باقی ہیں۔" عمو نے اسی لہجے میں کہا۔ اس کا انداز مصرعہ اٹھانے والا تھا۔

قمر خاموشی سے قرآن کو جزدان میں واپس رکھنے لگی۔

لڑکیاں ماں کی دلجوئی کے لئے آگئی تھیں۔ ان لوگوں نے روایتی برسی کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے دیگیں پکوا کر کھانا یتیم خانے اور کچھ غریب لوگوں میں بھجوا دیا تھا۔ تینوں ماں بیٹیاں خاموشی سے سر جوڑے، جانے والے کی کمی کو محسوس کرتی رہیں۔ انیس کے بغیر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ انیس جو بولتا کم تھا، لیکن سارے گھر پر حاوی، ساری فضا میں رقصاں رہا کرتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی سال بھر بعد بھی گھر میں کہیں نہ کہیں دبے پاؤں پھرتی رہتی تھی۔

رات کو عمو بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یکایک رضوانہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے رکی اور پلٹ کر بولی، مما، میں تمہارے ساتھ سو جاؤں۔ قمر کو گلے میں کچھ پھنستا سا محسوس ہوا۔ بولی کچھ نہیں صرف ایک ہاتھ بیٹی کے کاندھے پر رکھ دیا۔ رضوانہ کو محسوس ہوا اس لمس میں خوشی ہی نہیں، ممنونیت بھی تھی۔ بستر پر آنے کے بعد اس نے ایک معصوم بچے کی طرح سر ماں کے سینے سے ٹکا دیا۔

مما، ایک بات پوچھوں؟ کچھ دیر بعد اس کی سرگوشی سناٹے میں یوں سرسرائی جیسے درختوں کے درمیان ہلکی سی ہوا ہولے سے گزرے۔

"پوچھو بیٹا۔"

"پاپا مجھ سے اس قدر ناراض کیوں تھے؟ ایسا کیا کر دیا میں نے؟ انہوں نے جس طرح مجھے دیکھ کر منہ پھیرا اس کے اثر سے میں آج تک نکل نہیں پائی ہوں۔"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اب یہ جاننا فضول ہے۔" قمر نے بیٹی کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں باقی ساری عمر خلجان میں مبتلا رہوں گی، اس لئے جانتی ہوں تو بتا دیجئے۔

"کیا واقعی اس سے تمہیں سکون ملے گا؟ کیا تلخیوں کو نہ جاننا بہتر نہیں ہے؟"

"اس کا مطلب ہے آپ کو معلوم ہے۔ مما میری خلش دور ہوجائے گی۔ بات کتنی بھی کڑوی کیوں نہ ہو۔"

"اکرم کے والد نے ان کو فون کیا تھا۔ اکرم کی شادی ناکام رہی تھی۔" قمر نے طویل سانس لے کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ 'انہوں نے کہا، معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی کی نسبت ابھی تک کہیں طے نہیں ہوئی ہے۔ ہم پچھلی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ ان کے دوسری جگہ جانے کا سبب تمہاری ہٹ دھرمی تھی۔" کہہ کر قمر خاموش ہوگئی۔

"میں سن رہی ہوں۔"

انیس پہلے تو چراغ پا ہوئے، ان پر نہیں، تم پر۔ پھر دو چار دن کے توقف کے بعد کہہ دیا کہ انہیں اعتراض نہیں۔

"انہیں یہ معلوم تھا کہ اکرم نے بیوی کو طلاق ابھی نہیں دی ہے؟"

"یہ معلوم تھا، لیکن ان لوگوں نے کہا کہ رشتے کو منظوری

PDF Compressor Free Version

مل گئی تو طلاق نامہ بھیج دیا جائے گا۔ ان کی شہ پا کر ہی اکرم تمہارے پاس ایک بار پھر گیا۔"

"تو گویا آپ لوگوں کو بعد کی داستان بھی معلوم ہوگئی تھی۔"

میرا اتنی طویل ازدواجی زندگی میں ان سے سب سے بڑا جھگڑا اسی بات کو لے کر ہوا۔ آخری دنوں میں وہ مجھ سے بھی بہت ناراض رہے۔ ایک بار یہاں تک کہا کہ زندگی کا آخری پڑاؤ نہ ہوتا تو طلاق دے دیتے۔ میں بھی سخت غصے میں تھی۔ میں نے جواب دیا شاہ بانو تو پچھتر سال کی تھی۔ میں اس سے بہت کم عمر ہوں۔ وعدہ کرتی ہوں نان نفقہ کا دعویٰ نہیں کروں گی۔ اس یک طرفہ فیصلے کا حق آپ کو ملا ہی ہوا ہے۔ بسم اللہ۔"

پیروں کی جوتیاں اسی لئے منھ کو آرہی ہیں کہ پیسے کمانے لگی ہیں۔ مرد پر نان نفقے کی ذمہ داری تھی۔ تم پر نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے، اسی لئے اسے یہ حق دیا گیا۔ مگر تم...... وہ مارے غصے کے ہکلانے لگے۔

میں نے بات کاٹ دی۔" آج کے دور میں عورتیں برابر سے کام کر رہی ہیں تو مل جانا چاہئے انہیں بھی طلاق طلاق کہنے کا حق۔"

"اپنی مرضی سے کام کرتی ہو تم لوگ، صرف اس لئے کہ سر پر چڑھ جاؤ، سماج کے اصول توڑو، عیش کی زندگی گزارو پھر جب چاہے شوہر کو چھوڑ کر چل دو۔" بات تو شروع ہوئی تھی تمہاری اس، ترپاہٹ سے کہ تم اپنے سفید داغ کا ایک بار پھر چیک اپ نہیں کراؤ گی اور پہونچ گئی ہم دونوں کی ذاتیات پر۔ باقی ساری زندگی میں اس احساس جرم کے ساتھ جیوں گی کہ انیس کا بلڈ پریشر شاید اسی جھگڑے کی وجہ سے برابر ہائی رہنے لگا تھا۔ ایک دن ہیمرج کا سبب بن گیا۔

لیکن مما اکرم کا میرے پاس دوبارہ آنا تو پاپا کی بیماری سے بہت پہلے کی بات ہے۔" اسے آپ اپنے آپ سے کیوں جوڑ رہی ہیں۔"

"انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ تم نے دوبارہ اسے تقریباً دھکا دے کر نکال باہر کیا تھا۔ اس پر مرے پہ سو درے میں نے یوں بدزبانی کی۔ شاید میں بھی کبھی اس طرح نہیں چلائی تھی نہ کبھی ان کی بے عزتی کی تھی، معمولی بحث، چھوٹے موٹے اختلافات تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ممی، لیکن پھر بھی وجہ تو میں ہوئی نا۔ آپ اس احساس جرم سے چھٹکارا پا لیجئے، بالکل نارمل ہو کر زندگی بسر کیجئے۔ پاپا تو اب نہیں آسکیں گے۔ بس اتنا ہی کہوں گی۔"

"میں حتی الامکان نارمل زندگی ہی بسر کر رہی ہوں۔ مصروفیت کے ذریعے نکال لئے ہیں، دوستوں اور عزیزوں سے ملتی رہتی ہوں۔ اب تو تقریبوں میں بھی جانا شروع کر دیا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجھے merry widow کا خطاب دے رکھا ہے۔ ان کی پروا نہیں کرتی۔"

قدرے توقف کے بعد اس نے گلوگیر آواز میں ہولے ہولے کہا۔ "بیشک رات کو سائے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ کھڑکی کے سامنے والے چھتنار برگد پر پچھلی پیریاں دانت نکوسے ہنستی نظر آتی ہیں۔ میں گھبرا کر بغل میں انیس کو ٹٹولتی ہوں پھر چادر میں منھ چھپا کر سو جاتی ہوں۔ ہر صبح ایک نئے نارمل دن کا آغاز کرتی ہے۔"

فضائے بسیط میں ایک سناٹا پسر گیا۔ پھر ماں بیٹی کے آنسو گنگ وجمن کے پانیوں کی طرح ایک دوسرے میں گھل گئے کہ ایک دوسرے کے دکھ کو بہا لے جائیں، لیکن کیا دکھ بھی پوری طرح بہائے جا سکتے ہیں؟

ان دونوں سے بے خبر عمو اپنے کمرے میں بچوں کو کہانی سنا کر سلانے میں مصروف تھی، لیکن اس کہانی کا نام پارسائی بی کا بگھار نہیں تھا۔ عمو کو ایسی کوئی کہانی نہیں معلوم تھی۔ وہ انہیں ایلس ان ونڈر لینڈ (Alice in wonder land) سنا رہی تھی۔

اقوال زریں

- ☆ محبت کی راہ میں ذلتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں
- ☆ دوری محبت پیدا کرتی ہے
- ☆ موافقت نہ ہو تو جدائی بہتر ہے
- ☆ بگاڑ کا علاج سزا سے نہیں ہوتا
- ☆ توبہ کر لینا آدم کی سنت ہے
- ☆ جہاں تک ممکن ہو شک وشبہ سے بچو
- ☆ ملک ایک کھیتی ہے اور عدل اس کا پاسبان
- ☆ کمینہ کے لئے بے عزتی اس کے ساتھ مہربانی ہے

PDF Compressor Free Version

پروفیسر اعجاز علی ارشد
وائس چانسلر مولانا مظہر الحق اردو فارسی عربی یونیورسیٹی، پٹنہ

سفر نامہ

موریشس میں سات دن

موریشس کی تیسری عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے جب ہم نے ایرانڈیا اور ایر موریشس کی فلائٹ میں تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ۲۵ر نومبر ۲۰۱۵ء کو سر رام غلام انٹرنیشنل ایرپورٹ پر قدم رکھا تو سب سے پہلے تازہ اور خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور چند ہی منٹوں کے اندر اتنی آکسیجن ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی جتنی دہلی میں چند دنوں کے اندر بھی میسر نہیں آتی۔ ابھی ہم اس خوشگوار حیرانی کے حصار سے شاید ایک قدم بھی باہر نہیں نکل پائے تھے کہ اردو اسپیکنگ یونین کے نمائندوں شبنیز، جمیلہ اور فیاض علی وغیرہ نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ موریشس میں اردو کی نئی نسل کے نمائندوں سے کم از کم میرا یہ پہلا سابقہ تھا اور ایرپورٹ سے ہوٹل تک تقریباً آدھ گھنٹے کے سفر میں ہم سبھوں نے یہ محسوس کیا کہ اردو زبان وادب کی تہذیب تمام تر رنگ و بو کے ساتھ ہمارے میزبانوں کی شکل میں ہمارے پاس ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ زبان کا رشتہ بیحد مضبوط رشتہ ہوتا ہے ورنہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل کی دوری پر رہنے والے چند ہی منٹوں میں اس طرح گھل مل نہیں جاتے۔ بہر حال ہوٹل پہنچنے کے بعد بھی ہر مرحلے میں ان نوجوان رضا کاروں کا تعاون ہمیں میسر رہا۔

ہم نے جس آرام بلکہ تساہل کے ساتھ غسل اور طعام وقیام کے مرحلے طے کیے اس کا ذکر تفصیل طلب ہے، لیکن شام کے وقت اردو اسپیکنگ یونین کے دفتر واقع ۱۲ر عثمان ایونیو میں اردو زبان وادب کے مقامی جاں نثاروں کے ساتھ ہماری مختصر سی ملاقات ہمیں بے حد فعال بنا گئی۔ ان کی گفتگو نے احساس دلایا کہ اردو سے ان کی وابستگی پہلی سطح پر صرف اور صرف جذباتی ہے اور وہ اردو زبان وادب کو ایک تہذیبی ورثے کے طور پر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر محمد کاظم اور ڈاکٹر شگفتہ یاسمین تو میرے ہم سفر ہی تھے، یونین کے صدر دفتر میں ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے آنے والے مہمانوں میں سے چند ربھان خیالؔ، بھوپیندر عزیز پریہارؔ، راجیش نرائن ریڈی، پروفیسر شافع قدوائی اور ڈاکٹر وسیم بیگم سے بھی ملاقات ہوئی۔ پاکستان سے آنے والے مہمانوں میں سے جناب تحسین فراقی (لاہور) اور پروفیسر ذوالقرنین احمد (کراچی) تشریف فرما تھے۔ ان سے کھل کر گفتگو ہوئی۔ جرمنی کی ڈاکٹر کرسٹینا اور مصر کے ڈاکٹر جلال السعید بھی شریک گفتگو رہے، مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اردو اسپیکنگ یونین کے عہدہ داروں اور اردو کے مقامی جاں نثاروں مثلاً جناب شہزاد عبداللہ

بائیں سے دائیں: پروفیسر اعجاز علی ارشد، سکریٹری ساہتیہ اکادمی، شہزاد عبداللہ احمد صدر اردو اسپیکنگ یونین، ہندوستانی ہائی کمشنر انوپ کمار مدگل، ڈاکٹر شگفتہ یاسمین، ماریشس کی صدر محترمہ افسانہ خاکم، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، موریشس کے وزیر ثقافت، پاکستانی ہائی کمشنر میجر جنرل جناب رضا محمد

PDF Compressor Free Version

احمد (صدر) انور دوست محمد (سکریٹری) ڈاکٹر صابر گودڑ، عنایت حسین عیدن، ڈاکٹر ریاض گوکھل اور شعبۂ اردو کے نوجوان طلبا وطالبات کے ساتھ تبادلہ خیالات نے ہم میں ایک نئی توانائی بھر دی۔ چونکہ موریشس میں بیشتر دوکانیں شام پانچ بجے تک بند ہو جاتی ہیں اس لیے ہم یونین کے دفتر سے براہ راست اپنے ہوٹل واپس آ گئے اور دہلی کی سردی کے مقابلے میں یہاں کی معتدل آب وہوا سے دیر رات تک لطف اندوز ہوتے رہے۔ ہوٹل کے راستے اور گرد وپیش میں پھلوں سے لدے ہوئے لیچی کے درخت خاص طور پر ہماری توجہ کا مرکز رہے کیوں کہ ہمارے یہاں لیچی کا موسم مہینوں پہلے ختم ہو چکا تھا۔

موریشس میں ہمارا دوسرا دن بیشتر اندرا گاندھی سینٹر برائے ہندوستانی کلچر، فونکس میں گزرا۔ ٹھیک سوا دس بجے صدر جمہوریہ موریشس محترمہ امینہ غریب خاکم ہال میں تشریف لائیں۔ موریشس اور ہندوستان کے قومی ترانے سے تقریب کا آغاز ہوا۔ ڈائس پر ان کے ساتھ موجود مقامی وغیر مقامی لوگوں میں سے جناب شہزاد عبداللہ احمد، صدر اردو اسپیکنگ یونین نے استقبالیہ کلمات کہے، سری نواس راؤ، سکریٹری ساہتیہ اکادمی، دہلی نے فیسٹول آف انڈیا کے تناظر میں تیسری عالمی اردو کانفرنس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے صدارت کی کرسی سنبھالی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جناب احمد ندیم مصطفیٰ، ڈپٹی کمشنر آف پاکستان جناب انوپ کمار مدگل ہائی کمشنر آف انڈیا اور جناب سانتا رام بابو وزیر برائے آرٹ و کلچر نے موقع اور موضوع کی مناسبت سے اظہار خیال کیا۔ صدر جمہوریہ نے بھی تھوڑی دیر اردو اور اس کے بعد انگریزی میں سادہ مگر پر مغز تقریر کی۔ لوگوں نے بتایا کہ شعبۂ نباتات سے تعلق رکھنے والے اہم سائنس دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایسے میں اردو زبان وادب سے متعلق ان کے چند برمحل جملے مجھے حیرت انگیز بھی لگے اور مسرت خیز بھی۔ بہر حال، آخر میں اردو اسپیکنگ یونین کے سکریٹری جناب انور دوست محمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر شگفتہ یاسمین (ذی۔سلام چینل) نے بہت خوش اسلوبی سے نبھائی۔

چائے اور ناشتے کے بعد کانفرنس کا پہلا ورکنگ سیشن پروفیسر اعجاز علی ارشد کی صدارت اور جناب چندر بھان خیال کی نظامت میں شروع ہوا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اور عزیز پربھار نے مقالات پڑھے جن پر تبادلہ خیال بھی ہوا۔ چائے کے لیے ایک اور وقفے کے بعد پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی صدارت اور ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) کی نظامت میں دوسرا سیشن ہوا جس میں پروفیسر تحسین فراقی اور پروفیسر انور پاشا نے اپنے مضامین پیش کیے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے سے دس بجے تک ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں ملکی وغیر ملکی شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا۔

ہندوستانی ہائی کمشنر انوپ کمار مدگل، پروفیسر اعجاز علی ارشد کو اعزاز سے نوازتے ہوئے

عالمی کانفرنس کے دوسرے دن یعنی ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء کو پہلا اجلاس پروفیسر علی احمد فاطمی کی صدارت اور ڈاکٹر شگفتہ یاسمین کی نظامت میں ہوا، جس میں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ''اردو اور جدید تکنالوجی'' کے موضوع پر بے حد معلوماتی مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر شافع قدوائی نے ''عالمی تناظر میں اردو کے افسانوی ادب کی معنویت'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا اور جناب چندر بھان خیال نے ''عالمی تناظر میں اردو شاعری'' کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ چائے کے وقفے کے بعد ''موریشس میں اردو کی تدریس'' کے موضوع پر ڈاکٹر ریاض گوکھل نے اعداد وشمار کے ساتھ روشنی ڈالی، جب کہ ڈاکٹر وسیم بیگم نے ''جدید اردو ادب میں تانیثیت'' کے موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔ بحث ومباحثہ کا سلسلہ دراز تو

PDF Compressor Free Version

ہوا، مگر اس کے دراز تر ہونے سے قبل ہی اجلاس کے اختتام کا اعلان ہوگیا چونکہ جمعہ کی نماز کا وقت یہاں کی مسجدوں میں بھی ایک سے ڈیڑھ بجے دن تک ہی ہوتا ہے۔ جمعہ کی نماز ہم نے قریب کی ایک سادہ مگر کشادہ مسجد میں پڑھی۔ خطبہ عربی میں پڑھا گیا اور تقریر کچھ انگریزی، کچھ اردو اور کچھ مقامی زبان میں ہوئی۔

رات ساڑھے آٹھ بجے "محفل غزل" کے تحت پاکستان سے آئے ہوئے شاعر اور گلوکار عدیل خاں برکی نے ایسا سماں باندھا جو موریشس والوں کو دیوانہ بنا گیا۔ انہوں نے غزل کے علاوہ حمد، نعت گیت، نظم، دوہے اور ماہیے وغیرہ میں بھی اپنی آواز کا جادو جگایا۔ کم وبیش چار گھنٹے تک چلنے والی یہ خوشگوار محفل تشنگی کے ایک عجیب و غریب احساس کے ساتھ ختم ہوئی۔

موریشس میں ہماری موجودگی کا چوتھا دن عالمی اردو کانفرنس کا تیسرا دن تھا جب ورکنگ اجلاس پہلی بار قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ اس کے باوجود سب سے زیادہ مقالات اسی دن پڑھے گئے۔ پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر تحسین فراقی نے فرمائی اور نظامت ڈاکٹر وسیم بیگم کے حصے میں آئی۔ پروفیسر جلال السعید نے "مصر میں اردو کتابوں کا ترجمہ" اور ڈاکٹر کرسٹینا نے "جرمنی میں اردو" کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر صابر گودڑ نے موریشس کی اردو تخلیقات کا ایک سرسری جائزہ لیا جس پر تبادلہ خیال بھی ہوا۔ چائے کے وقفے کے بعد ڈاکٹر انور پاشا کی صدارت میں ڈاکٹر ذوالقرنین احمد (برصغیر کے باہر اردو کی درس وتدریس) اور ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے مقالے پڑھے۔ لنچ کے بعد آخری ورکنگ سیشن پروفیسر شافع قدوائی کی صدارت میں ہوا، جس میں جناب راجیش نرائن ریڈی اور ڈاکٹر محمد کاظم نے اپنے مضامین کا خلاصہ پیش کیا۔

بائیں سے دائیں: پروفیسر اعجاز علی ارشد، شہزاد عبداللہ احمد صدر اردو اسپیکنگ یونین، ہندوستانی ہائی کمشنر انوپ کمار مگل، ماریشس کی صدر محترمہ السانہ خاکم

عالمی کانفرنس کا اختتامی اجلاس اندرا گاندھی سنٹر برائے ہندوستانی کلچر میں ہی شام کے تقریباً چار بجے منعقد ہوا جس سے اردو اسپیکنگ یونین کے صدر جناب شہزاد عبداللہ احمد کے علاوہ ساہتیہ اکادمی دہلی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی ہائی کمشنر میجر جنرل (ریٹائرڈ) جناب رضا محمد، ہندوستانی ہائی کمشنر عزت مآب انوپ کمار مگل اور موریشس کے سابق نائب صدر جناب عبدالرؤف بندھن نے بھی خطاب کیا۔ یونین کے سکریٹری انور دوست محمد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ موریشس آنے کا وعدہ لے کر مہمانوں کو رخصت کیا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے فیسٹول آف انڈیا کے حوالے سے ایک قوالی کی محفل تھی جس میں وزیر اعظم، وزرائے محترم، ہندوستان اور پاکستان کے ہائی کمشنر اور ملک کے بیشتر عمائدین خاصے اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے، دہلی سے آئے ہوئے قوالوں نے ابتدا میں تو اچھا سماں باندھا، مگر بالآخر عوام کی توقعات تک نہ پہنچ سکے اور میں سمجھتا ہوں کہ محفل قوالی وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی ختم ہوگئی۔

۲۹/۳۰ نومبر اور پہلی دسمبر ہمارے لیے فرصت کے دن تھے، مگر ہم نے تصور جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہنے کے بجائے موریشس میں مشغول رہنے کا سب سے خوبصورت بہانہ ڈھونڈا یعنی ساحل، سمندر کا نظارہ۔ چاروں طرف سمندر سے گھرے ہوئے اس ملک کے ہم صرف تین ہی سمندری کنارے دیکھ سکے، کیوں کہ ہمارے پاس کوئی چوتھا دن نہیں تھا۔

پہلے دن ہم الیکزنڈا فال ویو پوائنٹ دیکھنے گئے۔ اس کے قریب ہی موریشس کا قومی پارک ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ ایسے درخت بھی ہیں، جن کی نسل پوری دنیا میں صرف یہیں دستیاب ہے۔ پارک سے باہر ایک وسیع جنگل ہے، جس میں جنگلی جانوروں کے علاوہ بڑی

PDF Compressor Free Version

تعداد ان درختوں کی ہے، جن کی چھال سے کاغذ بنایا جاتا ہے۔ آم، امرود اور لیچی کے درخت بھی دکھائی دیے جو نومبر کے اواخر میں بھی پھلوں سے لدے تھے۔ خاص طور پر کئی قسموں کے امرود یہاں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ یہاں سے کچھ دور مارا دکس واکوس کے مقام پر گنگا تالاب ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں شیو جی نے گنگا جل لا کر رکھا تھا۔ تالاب کے کنارے اکتالیس فٹ کے منگل مہادیو کی ایک مورتی ہے اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی استھاپت کی جارہی ہیں۔ سال میں ایک بار ''گنگا اشنان'' بھی ہوتا ہے جس میں دروغ برگردن راوی، تقریباً چار لاکھ لوگ شرکت کرتے ہیں۔

ساحل سمندر کا نظارہ دل افروز بھی تھا اور حیا سوز بھی۔ میں نے ابوظہبی اور دوبئی کے سفر کے دوران جمیرہ کے ساحل پر جو منظر دیکھا تھا وہ یہاں کچھ زیادہ ہی عریاں نظر آیا۔ چمکیلی تیز دھوپ ہر طرف بکھری ہوئی تھی اور فرحت بخش ہوا کے جھونکے تواتر کے ساتھ موسم کو خوشگوار بنا رہے تھے۔ دور تک پھیلا ہوا سمندر، اس کے کنارے ناریل کے درخت اور آسمان میں تیزی سے بھاگتے ہوئے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ''فردوس بروئے زمیں'' کا احساس دلاتے ہوئے ''صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے'' کا تقاضہ کر رہے تھے، مگر مردوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں خواتین بھی تیراکی کا لطف اٹھا رہی تھیں اور تھکنے کے بعد ساحل سمندر پہ جہاں تہاں فطری لباس میں آرام فرما تھیں، اس لئے ہم نے یہاں بھی اردو شاعری کے ایک مصرع کا سہارا لیا اور ''ہمت کہاں کہ دید کا احساس اٹھائیے'' پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ دوپہر کا کھانا ''تازہ واردان بساط اردو'' میں سے ایک یعنی ہماری گائیڈ مس جمیلہ چورامن کے گھر پہ تیار ہوا تھا۔ ان کے والد محترم نے جو پیشے سے ٹھیکہ دار اور ذوق وشوق سے اردو کے خدمت گار ہیں، بے حد لذیذ بریانی اور اس کے لوازمات سے ہماری خاطر کی اور ہمیں موریشس میں لکھنؤ اور دہلی کا لطف آ گیا۔ بہترین طعام کے بعد کچھ لوگ ساحل سمندر پہ محو خواب ہو گئے اور کچھ ٹورسٹ بس میں۔ چند ایسے بھی تھے جو تیز رفتار سمندری لہروں کے ساتھ دیر تک اور دور تک محو خرام رہے۔

تیسرے دن یعنی یکم دسمبر ۲۰۱۵ء کو ہم نے ایک اور سمت میں ساحل سمندر کا سفر اختیار کیا۔ یہاں کا منظر پچھلے دن سے زیادہ مختلف نہیں تھا، مگر فرق یہ تھا کہ آج سمندر کے کنارے گاڑیوں کی قطار بھی تھی اور فیملی والوں کی چہل پہل بھی۔ گویا تیراکی سے زیادہ سیر و تفریح کا ماحول تھا۔ تھوڑی دور آگے چل کر ایک چھوٹی سی پہاڑی دکھائی تھی جو Lover's Point کہی جاتی ہے۔ ویسے ہمیں تو سیدھی چڑھائی کے بعد پھولتی ہوئی سانسوں اور تین طرف سمندر کی موجوں کے سبب یہاں محبت سے زیادہ خودکشی کے امکانات نظر آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عہد گزشتہ میں محبت کا انجام بھی عام طور پر یہی ہوتا تھا۔ حال کا جو حال ہے وہ سبھوں کو معلوم ہے۔ بہرحال یہاں سڑک کے کنارے اعلیٰ درجے کے رہائشی ہوٹل اور ریسٹوران بھی دکھائی دیے۔ سرسبز علاقہ یہاں کچھ کم تھا، مگر صاف ستھری روشنی اور ہوا کی فراوانی تھی۔ یہاں سے ہم جلد ہی واپس لوٹ آئے چونکہ ہمیں اسی دن ہندوستان واپسی کی تیاری کرنی تھی۔

بائیں سے دائیں: چندر بھان خیال، پروفیسر علی احمد فاطمی
پروفیسر اعجاز علی ارشد (صدارت کرتے ہوئے)، بھوپیندر عزیز پریہار

دوسرے دن ہم نے یونیورسٹی آف ماریشس کے شعبہ اردو، ٹی۔ وی۔ سنٹر اور اندرا گاندھی کلچرل سینٹر سے ہوتے ہوئے چائنا بازار کے قدیم علاقے میں واقع جامع مسجد وغیرہ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے ہم موریشس یونیورسٹی کے کشادہ صدر دروازے اور خوبصورت باغات سے گزرتے ہوئے شعبہ اردو میں پہنچے۔ یہاں امتحانات چل رہے تھے اس کے باوجود صدر شعبہ آصف علی محمد کے علاوہ

PDF Compressor Free Version

خاصی تعداد میں ریسرچ اسکالرز، ایم۔فل اور پی۔ جی وغیرہ کے طلباو طالبات موجود تھے۔ یہاں کی لائبریری بھی دیکھی جس میں کتابیں ابھی زیادہ نہیں ہیں، مگر ترتیب و تنظیم سے اندازہ ہوا کہ طالب علموں میں مطالعے کا شوق کافی ہے۔ نصاب پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جو ابھی زیادہ Updated نہیں محسوس ہوا۔ یہاں کئی دوسرے شعبوں کے اساتذہ سے ملاقات اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ یونیورسٹی کے صدر دروازے پر طرح طرح کی دکانوں پر مختلف ملبوسات پہنے ہوئے طلبا و طالبات کی کثیر تعداد دیکھ کر کسی نہ کسی سطح پر یہ بھی محسوس ہوا کہ موریشس کی نئی نسل روایت کے دائروں سے نکل کر تیزی رفتاری کے ساتھ نئی صورتوں کو قبول کر رہی ہے۔

موریشس کے ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے دوسری زبانوں کی طرح اردو نشریات کا بھی وقت مقرر ہے۔ پروگرام میں زبان وادب کے موضوعات ومسائل کے علاوہ طالب علموں اور بچوں کی دلچسپی پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ ہم یہاں کی عمارت اور سرگرمیوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے اندرا گاندھی سینٹر برائے انڈین کلچر پہنچے۔ ''فونکس'' نام کے علاقے میں فن تعمیر کا یہ خوبصورت نمونہ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے متعلق بیشتر سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس کے قریب ہی مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میوزیم ہے جس میں ۱۸۴۰ء سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک کی تقریباً چار ہزار تصویریں محفوظ ہیں۔ ان تصویروں میں ہندوستان سے آنے والے تقریباً ان تمام قیدیوں کی تصویریں بھی ہیں جو موجودہ آبادی کے آباواجداد کہے جاسکتے ہیں۔ اس عہد کے برتنوں، اوزاروں اور ہتھیاروں وغیرہ کے نمونے یا تصویریں بھی ہیں اور بدلتے ہوئے منظرنامے کی عکاسی بھی موجود ہے۔

موریشس کے قدیم چائنا بازار میں کم وبیش ویسی ہی بھیڑ بھاڑ، دوکانوں کی کثرت اور طرح طرح کے خوانچہ فروشوں کی صورت نظر آئی جو ہندوستان کے پرانے شہروں میں دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اس کا پٹنہ کے سبزی باغ سے مقابلہ کرنا چاہا تو میرے ہم راہیوں نے دہلی کے شاہین باغ سے، مگر دونوں ہی کے مقابلے میں یہاں صفائی ستھرائی کا نظم کچھ زیادہ محسوس ہوا۔ سفید رنگ کی خوبصورت جامع مسجد میں داخل ہوئے تو سادگی میں پرکاری کا جلوہ ہر طرف دکھائی دیا۔ شان وشوکت نہ سہی مگر وقار اور معیار کا احساس ہر قدم پر ہوا۔ ظہر کی نماز میں کچھ دیر تھی، اس لئے ہم میں سے چند لوگ مسجد سے متصل پیر جمال شاہ کے مزار پہ چلے گئے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ۱۸۴۸ء میں بھج کے علاقے سے یہاں تشریف لائے تھے اور صرف دس برس کے بعد ۴۵ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس مختصر سی مدت میں بھی انہوں نے تبلیغ دین کا فرض اس خوبی سے انجام دیا کہ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اس ملک میں دین کو بنیاد عطا کی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی وفات کے بعد مسجد کے قریب ہی مدفون ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر انگریز افسر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لوگ جنازہ اٹھانے لگے تو وہ اٹھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اس انگریز افسر نے رات کو خواب میں خود اس صوفی فقیر کو دیکھا اور دوسرے دن مسجد کے بغل میں ہی تدفین کی اجازت دے دی۔

ساحل سمندر پر پورا گروپ لطف لیتے ہوئے

اسی علاقے میں ایک اور صوفی پیر جہانگیر میاں کا بھی مزار ہے جس کے بارے میں مختلف مستند روایتیں موجود ہیں، مگر ہم وہاں نہیں جاسکے اور پورٹ لوئیس کے ساحلوں کی طرف چلے گئے جہاں قدیم طرز کی عمارتوں اور تھوڑی بہت بوسیدگی یا معاشی بدحالی نے ہمیں احساس دلایا کہ علاقے جب پرانے ہوجائیں تو کیسے ہوجاتے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

ماریشس کی خوبصورت مسجد

گرچہ اس علاقے میں اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ بھی ہیں اور ایسے ہی ایک ہوٹل میں عالمی کانفرنس کے میزبان جناب شہزاد عبداللہ احمد نے صرف سمندری غذا (Sea-Food) کے مختلف پکوانوں سے ہماری پرتکلف ضیافت بھی کی مگر اس ساحل سمندر پر وہ شفافیت اور صفائی نظر نہیں آئی جو دوسرے ساحلوں پر تھی۔

پورٹ لوئیس میں واقع موریشس کا اسلامک کلچرل سینٹر بھی قابل دید مقامات میں سے ایک ہے۔ اس سینٹر کا قیام اگست ۱۹۸۷ء میں حکومت کی اس قومی پالیسی کے تحت ہوا تھا جس میں آبادی میں شامل سبھی طبقوں کو اپنی مذہبی اور تہذیبی وارثتیں محفوظ رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تقریباً دو برسوں بعد حکومت نے ۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ء کو اسلامک کلچرل سینٹر ٹرسٹ فنڈ ایکٹ پاس کر کے اسے ایک آئینی ڈھانچہ بھی فراہم کر دیا۔ اب تک اس ایکٹ میں تین ترمیمات بھی ہو چکی ہیں جن کے سبب سینٹر کو اپنی سرگرمیوں میں اضافے کے لئے بہتر مواقع فراہم ہو گئے ہیں۔

اسلامک سینٹر کی موجودہ چار منزلہ عمارت جو پورٹ لوئیس میں واقع ہے فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس کا افتتاح سنیچر ۱۳ مارچ ۲۰۰۴ء بمطابق ۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ کو وزیر اعظم موریشس پال ریمنڈ نے لیا تھا۔ سفید رنگ کی یہ عمارت سادگی، وقار اور طہارت کا ایک اچھا امتزاج ہے۔ اس کی گراؤنڈ فلور پر استقبالیہ کاؤنٹر، دفاتر، بورڈ روم، ایک کثیر المقاصد ہال (Multi purpose hall) ہے جس میں بیک وقت دو سو آدمیوں کی گنجائش ہے۔ پہلی منزل پر جدید ترین سہولیات سے آراستہ چھ کلاس روم (Lecture Room) کے علاوہ ایک کمپیوٹر لائبریری اور دوسری سہولیات موجود ہیں۔ دوسری منزل پر انتظامی امور سے متعلق دفاتر ہیں جو چھ مختلف سکشن میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسری منزل پر ایک کشادہ ہال اور لائبریری ہے۔ لائبریری میں مختلف زبانوں بشمول اردو کی کتابیں موجود ہیں۔ اس منزل کا یہ امتیاز اپنی جگہ ہے کہ اس کی بالکونی سے ایک طرف رنگ برنگی رہائشی عمارتوں، میناروں، مسجدوں مدرسوں اور دوکانوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف قدرت کے حسین نظاروں اور شاہ کاروں کا۔ عمارت کی سب سے نچلی منزل پر عالم اسلام کے مختلف مسائل و حالات سے متعلق نمائش لگانے اور دستاویزی فلمیں دکھانے کا خاص طور پر انتظام ہے۔ جب ہم لوگ اس عمارت میں پہنچے تو فلسطینیوں سے متعلق ایک نمائش لگی ہوئی تھی اور ایک فلم بھی دکھائی جا رہی تھی جس کے توسط سے بتایا گیا تھا کہ کس طرح ۱۹۴۶ء سے اب تک فلسطین سکڑتا جا رہا ہے اور اب صرف دس فی صد رہ گیا ہے۔ یہ سلسلہ مغرب کی اذان کے سبب بیچ ہی میں منقطع ہو گیا۔ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میوزیم کے اسٹائل میں یہاں مسلمانوں کی موریشس میں آمد، ان کی طرز رہائش، تعلیم و تربیت وغیرہ کا عہد بہ عہد بیان محفوظ ہے۔ مختلف سائز اور خط میں قرآن پاک کے نسخے بھی قابل دید ہیں۔

یکم دسمبر ۲۰۱۵ء کی قدرے سرد شام کو ہم سب ایک بار پھر اردو امپیکٹ یونین کے اس دفتر میں جمع ہوئے جو اپنی باہری طرز تعمیر کے اعتبار سے قدیم فرانسیسی یا پرانی ہندوستانی فلموں کے بنگلوں کی یاد دلاتا ہے، لیکن جہاں درونِ خانہ اردو تہذیب اپنی تمام تر حرارت اور

PDF Compressor Free Version

توانائی کے ساتھ ماڈرن سہولتوں سے ہم آغوش ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ وہاں سے ہم نے مختلف زبانوں کے اخباروں میں شائع شدہ کانفرنس کی خبریں اور تصویریں حاصل کیں اور واپسی کے سفر پہ روانہ ہوگئے۔ کئی گھنٹوں سے ہو رہی بارش کے باوجود سڑک پر کہیں پانی کا جماؤ نہیں تھا البتہ ہمارے میزبانوں کی آنکھوں میں آنسو موجود تھے۔

آخر میں چند احساسات خاص طور پر اپنے قارئین کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو اردو کے ساتھ جذباتی وابستگی کا وہ احساس ہے جس کی طرف میں نے ابتدا میں ہی اشارہ کیا ہے۔ یعنی یہاں کے اردو والوں یا مزید وضاحت کے ساتھ کہنا چاہیں تو مسلمانوں کے لئے اردو روزی روٹی کا وسیلہ بھی ہے اور بعض غیر ممالک میں آباد اپنے رشتہ داروں یا دوستوں سے رابطے کا ذریعہ بھی، مگر بنیادی طور پر اس زبان سے ان کی جذباتی وابستگی ایک تہذیبی ورثے کے طور پر ہے اور اس وراثت کو وہ کسی حال میں کھونا نہیں چاہتے۔ دوسرا احساس جو مجھے موریشس کے عوام سے ملتے ہوئے قدم قدم پر ہوا وہ ان کی خوش اخلاقی ہے۔ ان کے اپنے مفادات بھی ہیں اور ان مفادات کے حصول کے لئے تضادات یا اختلافات بھی، مگر ہندوستان یا پاکستان بلکہ خاص طور پر ہندوستان سے آنے والوں پر وہ اس طرح جان و دل نچھاور کرتے ہیں کہ اپنی محبتیں بھی دل لگی محسوس ہونے لگتی ہیں اور تیسرا پہلو گویا اس شعر سے عبارت ہے کہ۔

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا

خاکساری اور انکساری کے جس فطری اظہار کا مجھے یہاں احساس بھی ہوا اور مشاہدہ بھی، وہ کم از کم اپنے ملک میں تو نایاب ہے۔ یہاں کے وزرا اور ممبران پارلیامنٹ تو خیر "ہمہ وقت دستیاب" کا نمونہ ہیں ہی، وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ تک پوری طرح "عوامی" ہیں۔ آپ انہیں جلسوں، بازاروں اور عوامی اجتماعات میں نارمل انسانوں کی طرح بغیر کسی زیڈ پلس یا خصوصی سیکوریٹی کے نہ صرف چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں بلکہ وقت ضرورت ان سے ملاقات بھی کر سکتے ہیں۔ یہ احساس مجھے پہلی بار اس وقت ہوا جب عالمی اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں معزز صدر جمہوریہ نہایت سادگی کے ساتھ ڈائس پر تشریف لے آئیں اور اسی انداز سے رخصت بھی ہوگئیں۔ یہ احساس دوسری بار اس اطلاع کے سبب ہوا کہ افتتاحی اجلاس کے شرکا میں کئی وزرا، سابق وزرا، ممبران پارلیامنٹ اور ڈپٹی وزیر اعظم بھی ہیں جو ڈائس پر نہیں بلکہ جلسے کی مختلف صفوں میں موجود ہیں اور یہ احساس مزید گہرا اس وقت ہوا جب ہماری مقامی رہنما جمیلہ چورامن نے ہمیں بتایا کہ ان کے گھر سے قریب لاکاوین واکو امیں ۸۵ سال کے عمر دراز وزیر اعظم موریشس سر انی رودھ جگن ناتھ کا بھی مکان ہے جہاں نہ صرف یہ کہ وہ بغیر کسی خاص سیکوریٹی کے تقریباً ہر رات قیام کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی صبح گھر سے نکل کر Bread & Butter لانے بھی خود ہی چلے جاتے ہیں اور راستے میں ملنے والے شناسا لوگوں سے سلام و کلام بھی کرتے جاتے ہیں۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر مسز امینہ غریب خاکم کا بھی شہر میں ایک ذاتی مکان ہے جہاں وہ گاہے گاہے قیام بھی کرتی ہیں۔ مزید لطف کا احساس اس وقت ہوا جب موریشس کے سابق نائب صدر جناب عبدالرؤف بندھن نے ایک دعوت میں ہماری خاصی توضیع کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ جب وہ ہندوستان اور بہار کے دورے پر گئے تھے تو ایک دن سیکوریٹی والوں کو خبر کئے بغیر موریہ ہوٹل سے نکل کر گاندھی میدان اور کلکٹریٹ گھاٹ سیر کرنے چلے گئے تھے۔ جب میں نے ہندوستان کی زیڈ پلس سیکوریٹی کی تفصیلات بتائیں تو صدر، وزرا اور دیگر عمائدین بے حد

PDF Compressor Free Version

محظوظ ہوئے۔

ایک اور متاثر کرنے والی سچائی یہ ہے کہ یہاں مجھے دست گدائی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ممکن ہے موریشس کے کچھ علاقوں میں غربت ہو مگر مجھے یقین ہے کہ یہاں کے شہریوں میں عام طور پر دست طلب دراز کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ تو ہم میں سے کئی مہمانوں کو ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء کی دوپہر میں ہی ہوگیا تھا جب ہم ایک قریبی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے گئے تھے۔ نمازی تو بے شمار تھے، مگر نہ صرف مسجد کے صحن میں بلکہ دور دور تک کسی فریادی کا پتہ نہیں تھا۔ سڑکوں، چوراہوں اور بازاروں میں بھی ہمیں کوئی بھیک مانگتا ہوا نظر نہیں آیا۔ حد تو یہ ہے کہ جب ہم میں سے کئی لوگ چائنا بازار (پورٹ لوئیس) میں واقع جامع مسجد میں نماز ادا کرنے اور اس سے متصل پیر جمال شاہ کے مزار پہ فاتحہ پڑھنے کے لئے گئے، تب بھی کسی سوالی سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔ ایک مقامی بہی خواہ نے یہ مشورہ ضرور دیا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دونوں پیر کے جوتے الگ الگ جگہوں پر رکھے جائیں تاکہ چوری کا امکان نہ رہے۔

مجھے احساس ہے کہ میرا بیان طویل ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے میں موریشس کی چند اہم اردو دوست شخصیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی بات کو سمیٹنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جو ذہن میں آتا ہے وہ عنایت حسین عیدن کا ہے جو تقریباً نصف صدی سے موریشس میں اردو زبان وادب کی ترقی اور زبان کے جائز حقوق کی بازیابی کے لئے کوشاں ہیں۔ دوسرا اور تیسرا نام قاسم ہیرا اور ڈاکٹر صابر گودڑ کا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۷۰ء سے اب تک ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل سامنے آچکی ہے جن کا تذکرہ ایک مکمل مضمون بلکہ کتاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر عبدالرؤف بندھن کا نام لئے بغیر چارہ نہیں چونکہ وہ سیاست کی وادیٔ پرخار میں چلتے ہوئے اور موریشس کے نائب صدر رہتے ہوئے بھی اردو زبان کے فروغ کے لئے مسلسل سرگرم کار رہے ہیں۔ یہاں مجھے ایک بار پھر وہ نوجوان طالب علم یاد آرہے ہیں جو سات دن تک رضا کارانہ طور پر ہمارے ساتھ رہے۔ جمیلہ، شب نیز، نوشین، شیخ نوشاد، فیاض اور دوسرے نوجوان جس خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت میں مصروف ہیں اس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی اور ان سب کے گائیڈ، Source of Inspiration اور موریشس میں اردو تحریک کے روح رواں ہیں ڈاکٹر شہزاد عبداللہ جو اپنی تجارتی مصروفیتوں کو چھوڑ کر اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ Last but not the least کے طور پر چار مصرعوں میں انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ "تذکرہ ناتمام" فی الحال تمام کردوں۔

وہ جس کا نام ہے شہزاد اور نسبت ہے عبداللہ
وہ موریشس کی وادی میں عجب خادم ہے اردو کا
ہیں اس کے ساتھ جو احباب سب پھولوں کی صورت ہیں
خود اس کی ذات اک گلشن بھی ہے محور بھی خوشبو کا

وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور کوان کے چیمبر میں سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری مکمل تعارف کرتے ہوئے محکمہ کے پرنسپل سکریٹری جناب عامر سبحانی بھی نظر آرہے ہیں

PDF Compressor Free Version

منظومات

رضیہ سبحان

A-374, Block D, North Nazimabad, Karachi 74700 Pakistan

محبت

روح میں آج جو پھیلی ہے محبت کی مہک
دل نے جانا کہ محبت کی حقیقت کیا ہے
یہ تو اک نور کا ہالہ ہے کہ جس میں آ کر
ہو کے رہ جاتی ہے مدفن یہ بدن کی خوشبو
یہ تو اک ایسا سمندر ہے کہ جس میں ڈوبا
دلِ آزردہ سے بہتا ہوا خوں رنگ لہو
اس میں روپوش ہوئے جاتے ہیں غم کے طوفاں
اس میں چپ چاپ بہے جاتے ہیں لمحوں کے نشاں
یہ سیہ رات کو دیتی ہے امیدوں کی ضیا
سرد ہوتے ہیں یہاں ہجر کے تپتے صحرا
اس میں کھو جائیں ابھرتے ہوئے نفرت کے بھنور
نہ ہو پھر شورِ بغاوت ، نہ کہیں رقص شرر
اس میں خوابیدہ رہے بسترِ ارماں کی شکن
اس میں اترے ہے یہ پھیلی ہوئی صدیوں کی تھکن
روح پژمردہ میں کھل جائے مری ، مہکائے
لمحہ وصل میں ڈوبا یہ محبت کا گلاب

❁❁❁

ایک تصویر.....

عجب اک کرب اور اک درد کی تصویر دیکھی ہے
لب ساحل کسی معصوم کی جب لاش دیکھی ہے
مہکتا پھول چکنی ریت پر اک معجزہ بن کر
اچانک صبح دم ساحل پہ آ کر کھل اٹھا جیسے
یہ لہریں بے بسی سے اور دھیرے سے
اسے چومیں کبھی، اس کی بلائیں لیں
یہ بادل ساتھ ہو کر سوگ میں ڈوبے
ہوائیں ماتمی ہو کر بہت بے چین سرگرداں
موجوں کی لکیروں نے جو اک تحریر لکھی ہے
اسے کوئی نہیں پڑھتا، اسے کوئی نہیں پڑھتا
کہ یہ تہذیب کیسی ہے
جہاں انسانیت کے نام پر
انساں ہی مرتا ہے،
وہ بچہ سو گیا ہے ایسے
جیسے تتلی اڑتے اڑتے
تھک کر پھول پر سوئے
کوئی ہے آج جو انسانیت کے نام پر روئے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

تبسم فاطمہ

104 D, Taj Enclave, Geeta Colony, Delhi

تین نظمیں

ہندستانی عورتوں کے نام

ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی
کہاں آزاد تھے
صدیوں سے ہمارے بنائے جانے کے
رسم ورواج کا خاتمہ ہی نہیں ہوتا

صدیوں میں ایک رسم ورواج کے خاتمے کے بعد
دوسری رسم ورواج کا چلن شروع ہوجاتا
اور ہر رسم ورواج
اس مردانہ سماج میں
ہماری ہی قربانی دینے کو موجود ہوتے

داسی پرتھا اور ستی پرتھا کے
قصے پرانے کہاں ہوئے
بس شکلیں بدل جاتی رہیں
ہم تب بھی مر رہے تھے
ہم اب بھی مر رہے ہیں
مٹی کے تیل، تیزاب سے گیس سلنڈر تک
جلائے جانے کا ڈھونگ اب بھی جاری ہے
اب بھی روندا جارہا ہے ہمیں
سڑکوں پر
دفتروں میں
بسوں میں
اب بھی ہر موڑ پر رسوا ہو رہی ہیں
ہزاروں دامنی

قانون کی کتابوں میں ہونے والی
ترمیم کے باوجود
رادھا، مریم اور سیتا وہیں کھڑی ہیں

ہر بار جاگ جاتا ہے بدن کا رقص
ہر بار پیدا ہوجاتے ہیں نئے کنس اور راون
ہر بار سجنے کے لیے ہوتی ہے
ہماری ہی چتا

وہ کہانیاں مکالموں سے زیادہ نہیں ہیں
جہاں سنائی جاتی ہیں
بڑی بڑی مجلسوں میں

PDF Compressor Free Version

ہماری کامیابی کی کہانیاں
فخر سے بیان کیا جاتا ہے
ایوریسٹ پر چڑھنے والی ہماری اڑان کو
بتایا جاتا ہے کہ
اقتدار کے گلیاروں سے ہوائی جہاز
فلم، میڈیا سے انتظامیہ کے سب سے اونچے عہدے پر
اب کی جارہی ہے ہماری تاجپوشی
آرام سے سنی جاسکتی ہے
حیوانیت میں نہائے بھیڑیوں کی
کرخت، دل دہلا دینے والی آوازیں
چمک محسوس کی جاسکتی ہے
گدھ آنکھوں کی

کسی سیاست داں کے بیڈروم سے
کیمرے کی ننگی آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں ہماری طرف
کسی اسٹنگ آپریشن میں
ننگے ہو رہے ہوتے ہیں ہم
لذیذ قیمے اور کباب کی طرح
شراب کی محفلوں میں
لیا جارہا ہوتا ہے ہمارا ذائقہ
ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے بھی
نیلام ہو رہے ہوتے ہیں

صدیوں میں
کچھ بھی نہیں بدلا
بدلتی ہوئی ہر تہذیب کے بعد بھی
ہمارے لیے
وہی ہڑپا اور موہن جداڑو کی
تہذیب ہی باقی رہ جاتی ہے

بنگلہ دیش کی عورتوں کے نام

وہاں دو طرح کی عورتیں بستی ہیں
ایک جن کا تعلق حکومت کے گلیاروں سے ہوتا ہے
وہ حکومت کے تخت پر بیٹھی
بیچ رہی ہوتی ہیں عقیدے اور مذہب کو
اور دوسری
تسلیمہ جیسی عورتیں ہیں
جو مذہب کی آڑ میں ادب کا سودا کرتی ہیں
سارے عالم میں گھومتی ہیں
اور اپنی ہجرت کے پیسے وصول کرتی ہیں

تیسری طرح کی عورت یہاں نہیں ہے
وہ یا تو ماردی گئی ہے
یا چھپ گئی ہے
گھر کی کال کوٹھری میں
مذہب کی بندشوں اور گھٹن میں

PDF Compressor Free Version

اسے بچے پیدا کرنے کی آزادی تو ہے
مگر بولنے کی نہیں
پیدا ہوتے ہی
سیاہ پڑی دیواروں کے درمیان
گھونٹ دیا گیا ہے اس کا گلا

وہ سچ مچ کہیں نہیں ہے
اس سیاسی، سماجی اور تہذیبی
منظر نامہ میں
اور عورت ہونے کے حلف ناموں کے ساتھ کہہ سکتی ہوں
مذہب بیچنے والی اور مذہب کا سودا کرنے والیوں
کے درمیان
اپنے ہی ملک کا، کبھی ایک حصہ رہنے والی یہ زمین
اب ان کی ہلاکتوں پر ماتم کر رہی ہے

میرا کیا ہے، تم سوچونا.....

میرا کیا ہے.....
میں کیوں سوچوں.....؟
آگے رستہ بند پڑا ہے یا کوئی منزل بھی ہے
چاروں طرف پرشور سمندر یا کوئی ساحل بھی ہے
چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں اور درد کا بھی احساس نہیں ہو
میں کیوں سوچوں، کوئی جو مجھ سے غافل بھی ہے؟
میرا کیا ہے.....

بچپن کی پہلی ٹھوکر سے جس نے سنبھلنا سیکھ لیا ہو
نازک کچی عمر سے جس نے آگ پہ چلنا سیکھ لیا ہو
ڈر سے باہر آ کر جس نے ہر پل مرنا سیکھ لیا ہو
اڑنا جس کا مقصد ہو اور جس نے اڑنا سیکھ لیا ہو
میں کیوں سوچوں.....؟
آنے والا لمحہ میرا دوست ہے یا کہ دشمن ہے؟
دل کا ملنا قید، گھٹن ہے یا سندر سا بندھن ہے؟
میرے جیسا میرا سایہ، اس پر تن من ارپن ہے؟
جیون میں ہے پریم چھپا، یا پریم میں سارا جیون ہے؟
میں کیوں سوچوں؟
میرا کیا ہے.....
عشق اگر ہے آگ کا دریا
پھر مجھ کو یہ آگ پسند ہے
'ایک محبت سب کا حل ہے'
مجھ کو بس یہ راگ پسند ہے
میں کیوں سوچوں.....
میرا کیا ہے.....
اپنی آگ میں جلنا کیا ہے، اب میں جلاتی ہوں
میں بھی پتھر ہو سکتی ہوں، یاد دلاتی ہوں
رستہ بند جہاں ہوتا ہے، ڈھونڈ کے آتی ہوں
اپنے دم سے پت جھڑ کی بھی پیاس بجھاتی ہوں
میرا کیا ہے.....
تم سوچونا.....؟

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شہلا تزئین

C/o Dr. M.M.Ahmad, North East, Lal Kothi
Tatarpur, Bhagalpur 812002

نئے برس کا نیا سویرا

وہ دیکھو پورب سے آرہا ہے نئے برس کا نیا سویرا
نئی امیدوں کی روشنی میں بدل رہا ہے گھنا اندھیرا
نئے تصور ، نئی امنگوں کے ساتھ چھیڑو نیا ترانہ
زمانہ تم کو پکارتا ہے لگا رہا ہے وہ تازیانہ
بھلا دے ماضی کی تلخیاں جو دکھا دو کر کے وہ کارنامہ
نئی رتوں میں، نئی لگن سے گگن پہ گاڑو نیا پھریرا
وہ دیکھو پورب سے آرہا ہے نئے برس کا نیا سویرا
نئے زمانے کی تاب وتب میں چھپا ہے وہ جوہری خزانہ
خراب خانے کو جو بدل کر بنا دے پل میں نگارخانہ
اسی کے دم سے بنے گی دنیا سکون وراحت کا آشیانہ
زمین چھوٹی پڑی ، فلک پر بناؤ اپنا نیا بسیرا
وہ دیکھو پورب سے آرہا ہے نئے برس کا نیا سویرا
لٹے نہ کوئی نہ کوئی لوٹے ، چھنے کسی کا نہ آب و دانہ
شکار کوئی نہ ہو کسی کا ، کوئی کسی کا نہ ہو نشانہ
زباں پہ آئے جو ہو حقیقت ، سنے جو کوئی نہ ہو فسانہ
جہاں محبت کی ہو عبادت ، وہیں پہ ڈالو تم اپنا ڈیرا
وہ دیکھو پورب سے آرہا ہے نئے برس کا نیا سویرا
نشان جنت وطن ہمارا بنے جہاں میں وطن یگانہ
سنے جہاں دل دلوں کی دھڑکن، فضا جہاں کی ہو دوستانہ
خدا کرے ہر خدا کے بندے کو راس آئے نیا زمانہ
مری دعا ہے تمہارے سر ہو جہانبانی کا نیا سہرا
وہ دیکھو پورب سے آرہا ہے نئے برس کا نیا سویرا

شبانہ عشرت

Pathar Ki Masjid, Opp. Shaadi Mahal, Patna 800006

ظلمتوں کے سائے

تم اندھیرے کے طلبگار رہو گے
روشنی کی کرن سے کہہ دینا
اب نہ آئے تمہارے رستے میں
اجلی اجلی سحر سے کہہ دینا
گھر کی دہلیز پہ نہ رکھے قدم
صبح کی کھڑکیوں پہ ظلمت کی چادریں تان دینا ایسے کہ
پھر نہ کوئی کرن اجالے کی گھر کی چوکھٹ کو پار کر پائے
دور تک ظلمتوں کے سائے میں دیش کی ہر فضائیں ڈوبی ہیں
ظلمتیں نور پہ یوں حاوی ہیں
ہر طرف راج ہے اندھیروں کا
کل کے سورج کو جا کے کہہ دینا
دور دنیا سے جا کے چھپ جائے
کیوں کہ اس دیش کو اندھیروں سے پیار اتنا بڑھا کہ
ہر ساعت روشنی پہ پڑی ہے بھاری پھر
حق و باطل کی جنگ جاری پھر

PDF Compressor Free Version

عاصمہ صدیقی
Near Town High School, Katra Mandai
Sultanganj, Patna 800006

آرزو

چلو نہ
اس شہر چلتے ہیں
جہاں بندشیں نہیں ہوتیں
جہاں گلے شکوے تو ہوتے ہیں
پر روٹھنا منانا بھی ہوتا ہے
جہاں بیزاری تو ہوتی ہے
پر سکونِ دل بھی ہوتا ہے

چلو نہ
اس شہر چلتے ہیں
جہاں نفرت نہیں ہوتی
جہاں تکرار تو ہوتی ہے
پر محبت کی صدائیں بھی
وقفہ وقفہ پر بلند ہوتی ہیں

چلو نہ
اس شہر چلے ہیں

❁❁❁

سیدہ ماہ نور سیدہ
Saif Sahsarami, Barhaman Toli, Sahsaram

عورت

میں عورت ہوں
مرے وجود سے
یہ کائنات رنگیں ہے
مرے جمال سے
روشن ہے
دشت تیرہ شبی
مرے خیال کی
وسعت کو پا سکا نہ کوئی
مری نگاہ سے
راز حیات کھلتا ہے
مرا بھی حصہ ہے
تخلیق ابن آدم میں
میں ایک راز ہوں
دہر فنا کے سینے کا
میں بزم شعر و سخن کی
مزاج داں ٹھہری
میں تخت و تاج و حکومت کی
راز داں ٹھہری
مرے وجود میں
خالق کا راز پنہاں ہے
پلے ہیں
میری ہی آغوش میں
نبی و ولی
جہان نو میں
مری مختلف ہیں تصویریں
ہر ایک رشتہ ہے
پاکیزگی کا آئینہ

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

الماس شمی

City- EL Paso, State, Taxes, USA

غزلیں

سوال کیسے کروں میں اس سے جواب ہے جو مری دعا کا
کرے گا کیسے وہ بے وفائی ، مجھے یقیں ہے مری وفا کا

نہ اس سے ملنے کی ہے تمنا ، نہ اس کو پانے کی آرزو ہے
دیا محبت کا جل رہا ہے ، جو جی میں آئے کرے ہوا کا

جو بادلوں پر میں چل رہی ہوں ، تو آسمانوں کو چھو رہی ہوں
کہ ساتھ میرے ہی چل رہا ہے ، وہ ہاتھ تھامے ہوئے گھٹا کا

میں اس کے شعروں میں ڈھل رہی ہوں ، وہ میرا لہجہ بدل رہا ہے
میں چپ رہوں اور کہوں نہ کچھ بھی ، یہی تقاضہ ت وہے حیا کا

بھلائے بیٹھی ہوں ساری دنیا ، دھڑک رہا ہے وہ میرے دل میں
جو دوریاں ہیں سمندروں کی وہ فاصلہ بے بس اک صدا کا

❁❁❁

جب وہ مجھ سے کلام کرتا ہے
دھڑکنوں میں قیام کرتا ہے

لاکھ تجھ سے ہے اختلاف مگر
دل ترا احترام کرتا ہے

دن کہیں بھی گزار لے یہ دل
تیرے کوچے میں شام کرتا ہے

ہاتھ تھاما نہ حال ہی پوچھا
یوں بھی کوئی سلام کرتا ہے

وہ فسوں کار ، اس قدر ہے شبیؔ
بیٹھے بیٹھے غلام کرتا ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

بدر جہاں خورشید بدر

Chaman Sarai, Sambhal (U.P.)

غزلیں

جب کسی زر دار کے ٹکڑوں پہ پلتا ہے قلم
کھا کے سونے کے نوالے آگ اُگلتا ہے قلم

کوہ کن سا حوصلہ جب عشق دیتا ہے اسے
سنگ کے سینے پہ تیشہ بن کے چلتا ہے قلم

جب تصور میں کوئی تصویر آ جائے تو پھر
برسر قرطاس ہونے کو مچلتا ہے قلم

ہاں اگر مظلوم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لے
شمع کی صورت سے جلتا اور پگھلتا ہے قلم

سینکڑوں محروم مر جاتے ہیں اس کے قرب سے
جس پہ ہو رب کی عطا اس کو ہی ملتا ہے قلم

❁❁❁

سکونِ دل سے یہاں مالا مال کتنے ہیں
ہمارے شہر میں آسودہ حال کتنے ہیں

سزا جزا یہ ثواب و عذاب و ہراس
اس ایک جان پہ آخر وبال کتنے ہیں

سرابِ عشق نے جھلسا دئے بدن سب کے
مسافرانِ غم خوش خصال کتنے ہیں

اسی لئے تو مرے زخم منفرد ہیں بہت
میرے حریفوں میں سب بے مثال کتنے ہیں

جو شہر ظلم کی بنیاد تک ہلا دیں مگر
تجھے خبر ہے کہ وہ نونہال کتنے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

غزلیں

صدف جہاں

I, 99, Rameshwarpur Road
Matiabraj, Kolkata 700024 (West Bengal)

عکس آیا جو نظر پانی میں
پانی پانی ہے گہر پانی میں

پتلیاں کہتی ہیں آنکھوں کی
ہم تو کرتے ہیں بسر پانی میں

کس طرح تم کو بتائیں لوگو!
کیسے ڈوبا ہے نگر پانی میں

بھیگی بھیگی سی فضائے شب ہے
ڈوبا ڈوبا ہے قمر پانی میں

ہجر میں ان کے روتے روتے
کٹ گئی شام و سحر پانی میں

سلمیٰ حجاب

3/32 Vipul Khand, Gomti Nagar
Lucknow 226010

ہرا دوپٹہ اوڑھ کے نکلی ساون کی البیلی دھوپ
جیسے الھڑ دوشیزہ ہو ایسی نئی نویلی دھوپ

جھل مل کرتے تارے بجھ گئے چاند کا جادو اتر گیا
دبے پاؤں تب سورج نکلا چپکے چپکے پھیلی دھوپ

سارے رنگ دھنک کے اس میں، پھر بھی اجلی اجلی ہے
بیٹھ کے سب سلجھائیں اس کو بن گئی ایک پہیلی دھوپ

بخش دیا سورج نے اس کو دریا ایک سرابوں کا
صحرا صحرا بھٹک رہی ہے پیاسی آج اکیلی دھوپ

بند دریچے، بند ہے کھڑکی، بند ہیں سارے دروازے
گھر آنگن میں پھول کھلائے کیسے رنگ رنگیلی دھوپ

اس کو جب سے باندھ لیا ہے اپنے رنگیں آنچل میں
سایہ بن کے ساتھ ہے میرے، اب ہے مری سہیلی دھوپ

حسن خرام ناز پہ اپنے موجِ صبا تو ناز نہ کر
رقص کیا ہے طوفانوں نے جب پانی سے کھیلی دھوپ

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	میر کلو کی گواہی (انتخاب طنزیات مانپوری)
مصنف و ناشر	:	ڈاکٹر نعیم شاہد
اشاعت	:	۲۰۱۴ء
صفحات	:	۲۷۲
قیمت	:	۳۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر شائستہ انجم نوری

علم و ادب کی دنیا میں اگر ایک طرف تصنیفات کی اہمیت مسلم ہے تو دوسری طرف ان کتابوں کی اہمیت اور ضرورت بھی کچھ کم نہیں جو تعلیقات، شروح و حواشی اور تالیفات کی شکل میں منظر عام پر آتی ہیں، خصوصاً مرتبہ کتابوں کی افادیت تو اس طرح دو چند ہو جاتی ہے کہ ان میں قاری کو حسب موضوع ایسے منتشر اور کمیاب مواد ہی یکجا نہیں ملتے ہیں جن تک رسائی بصورت دیگر کوہ کنی کے مصداق ہو، بلکہ مقدمے اور توضیحات کی شکل میں مرتب کی قیمتی تحریر بھی اسے بہت ساری برجستہ معلومات سے نواز دیتی ہے۔ شاید اسی لئے علمی و ادبی تالیفات کو نیم تحقیقی و تنقیدی کارنامہ کہا جاتا ہے۔ اس تعلق سے اگر چہ یہ صحیح ہے کہ انتخاب کا عمل چنداں آسان نہیں ہوتا اور بسا اوقات وہ اعتراضات کے سینکڑوں دروازے بھی کھول دیتا ہے، لیکن اگر خاص احتیاط اور شعور و ادراک کے ساتھ یہ عمل انجام پذیر ہو تو اس کی دائمی قدر و قیمت تسلیم شدہ ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ڈاکٹر نعیم شاہد کی پیش نظر مرتبہ کتاب ''میر کلو کی گواہی'' ایک کامیاب اور مستحسن علمی کاوش کا درجہ رکھی ہے۔

زیر نظر کتاب اصل میں انجم مانپوری کی طنزیات کا انتخاب ہے اور اس لحاظ سے گویا وہ اس کے مصنف قرار پاتے ہیں۔ انجم مانپوری کا زمانہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کا زمانہ ہے۔ ان کی ''طنزیات'' دو حصوں میں بالترتیب ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۰ء میں چھپی تھی جسے بعد کے زمانے میں ''نورتن'' کے نام سے ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اب مصنف کی وفات کے تقریباً ۵۶ سال بعد جناب نعیم شاہد نے اس کا ایک جامع اور خوبصورت انتخاب اہل ذوق کی بزم میں لایا ہے اور اس کا نام ان کی سب سے معروف تخلیق کے نام پر رکھا ہے۔ بیشک انجم مانپوری اور ''میر کلو کی گواہی'' ہمارے ادبی حافظہ میں لازم و ملزوم کی حیثیت سے جگہ پا چکے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں انجم مانپوری کی خدمات اور خصوصاً ان کی مذکورہ تخلیق اَمر ہو چکی ہے۔

پیش نظر کتاب کا سرورق بامعنی پس منظر کے ساتھ جناب انجم مانپوری کی تصویر سے آراستہ ہے اور پس ورق پر تصویر کے ساتھ مرتب کتاب ڈاکٹر نعیم شاہد کا مختصر تعارف درج ہے۔ کتاب کا پہلا اندرونی فلیپ جناب قیوم خضر کی تصویر اور حضرت مانپوری کے بارے میں ان کی تاثراتی تحریر سے مزین ہے، جس میں انہوں نے تمثیل و استعارے کی زبان سے کام لیتے ہوئے انجم مانپوری کو طنز و مزاح کے تاج شاہی کا ''ہیرا'' کہا ہے اور بہت لطیف انداز میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی کور چشمی اسے پہچاننے سے مانع ہے۔ کتاب کا آخری اندرونی فلیپ جناب معین شاہد کی تصویر اور انجم مانپوری کے بارے میں ان کی تنقیدی و تجزیاتی تحریر سے مرصع ہے، جس میں انہوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''انجم مانپوری بہار کے وہ منفرد انشا پرداز اور مزاح نگار ہیں جنہوں نے اردو طنز و مزاح کو سرشار کے خوجی، سجاد حسین کے حاجی بغلول اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کی طرح میر کلو کا یادگار و بے مثال کیرکٹر عطا کیا۔ 'میر کلو' کا کیرکٹر اردو طنز و مزاح کے ادب میں ایک منفرد

PDF Compressor Free Version

حیثیت رکھتا ہے۔"

پیش نظر کتاب کا "دیباچہ" خود مرتب کے قلم سے ہے جو ص ۶ سے ص ۴۲ تک کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ طویل دیباچہ برجستہ اقتباسات اور حوالہ جات سے مزین ہے اور اس میں دیباچہ نگار نے ادب و زندگی کے رشتے، ظرافت کی اہمیت، طنز و مزاح کی تعریف اور انشائیہ نگاری پر کے فن اظہار خیال کرتے ہوئے "انجم مانپوری اور موضوع"، "انجم مانپوری اور مقامی بولی"، "انجم مانپوری اور محاورے و مثل"، "فرہنگ مانپوری"، "مانپوری اور فرنگی زبان"، "گلستان مانپوری"، "مانپوری اور مزاحیہ کردار نگاری" اور "انجم مانپوری کی مختصر سوانح حیات" جیسے ذیلی عناوین قائم کر کے اپنے ممدوح کتاب کے بارے میں تجزیاتی گفتگو سطر بہ سطر آگے بڑھائے ہوئے بتایا ہے کہ "باقیات مانپوری کا مقام موضوع کے اعتبار سے نمایاں و منفرد" ہے۔ انہوں نے "انشائیوں میں مکھی الفاظ کا فنکارانہ استعمال کیا ہے نیز ان کے یہاں "محاوروں کے برمحل استعمال میں نمایاں حسن" ملتا ہے اور لطف یہ ہے کہ "یہ محاورے بہاری لب و لہجہ میں نبھائے گئے ہیں" جن سے "رنگ ظرافت بھی نکھرتا ہے" انجم مانپوری "الفاظ کو نئے اور دلچسپ پیراہن عطا کرنے میں مہارت" رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے انشائیوں کا عنوان انگریزی ہے اور یہ بھی ایک طرح کا طنز ہے۔ بعد ازیں "دیباچہ" کی اختتامی سطروں میں یہ لکھتے ہوئے کہ:

> "انجم مانپوری اپنے عہد کے ایسے مزاح نگار تھے جو اپنی دانشوری کا ڈھونگ نہیں رچاتے اور نہ ہی معنوی و فکری لحاظ سے اپنے زعم کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہنسنے اور ہنسانے کے رویے کو موضوع کے پس منظر میں اس طرح لے جاتے ہیں کہ ہمیں ہنستے کھیلتے کسی بڑی بات کا پتہ چل جاتا ہے۔"

اپنی زیر نظر مرتبہ کتاب کے تعلق سے بتایا ہے کہ:

> "میں نے کوشش کی ہے کہ ان کے مضامین کے انتخاب میں ایسا ہی رویہ اپنایا جائے اور قاری کو یہ موقع دیا جائے کہ آج سے تقریباً ستر، اسی سال پہلے انجم مانپوری اپنے فکر و فن کی روشنی میں کتنے زیادہ جدید تھے اور کتنے زیادہ روایت کی پابندی کرتے ہوئے بغاوت کر جاتے تھے اور اس بغاوت میں ہمیں دونوں مزہ ملتا تھا، احتجاج کا بھی اور انحراف کا بھی۔ میں نے اپنی سی ناچیز کوشش کی ہے کہ ان کے تخلیقی مضامین کا ایسا انتخاب پیش کروں جو کہ آج کے دور سے مماثلت حاصل کرے اور ہمیں اندازہ ہو جائے کہ انجم مانپوری تکنیک کی روایتی کمزوری کے باوجود کتنا زیادہ طاقت ور تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔ اگر ان کے مضامین کا یہ انتخاب اسی روشنی میں پڑھا جائے تو بحیثیت مرتب مجھے اطمینان ہوگا اور شاید میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔"

اگرچہ یہ درست ہے کہ اس "دیباچہ" کا جو بالکل آخری پیراگراف سامنے آتا ہے، وہ تکرار مضمون کی کیفیت کا احساس دلا جاتا ہے اور مذکورہ اقتباس میں بھی "..... قاری کو" کے بعد "یہ سمجھنے کا" جیسا کوئی فقرہ چھوٹا ہوا لگتا ہے، لیکن اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ڈاکٹر شاہد نعیم شاہد نے جس نظریے کے تحت یہ انتخاب مرتب کیا ہے، اس میں وہ کامرانی بدست ہیں۔

"دیباچہ" کے بعد "مقدمہ اولیٰ" کی شکل میں علامہ جمیل مظہری کے قلم کا وہ عطیہ ہے، جو انہوں نے ۱۹۵۰ء میں "طنزیات مانپوری" حصہ دوم کی اشاعت پر تحریر کیا تھا اور اس میں دو رائے نہیں کہ علامہ کا یہ مقدمہ اپنے اسلوب و افکار کے لحاظ سے آج بھی بصد شوق پڑھنے کی چیز ہے، خصوصاً یہاں اس کی شمولیت نے ایک خاص ماحول دیا ہے اور زیر نظر تالیف کی وقعت بڑھا دی ہے۔ بعد ازیں "انجم مانپوری: شہنشاہِ ظرافت" کے عنوان سے جناب معین شاہد کی تحریر نے جگہ پائی ہے۔ یہ خاص علمی و معلوماتی تحریر ہے۔ اس میں جناب معین شاہد نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر محمد حسنین نے

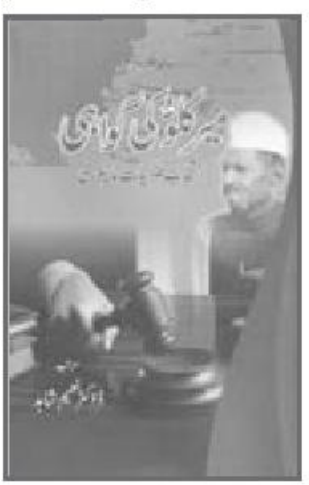

PDF Compressor Free Version

''بہار کے نو چراغ'' میں انجم مانپوری کو بحیثیت انشائیہ نگار لیا ہے۔ یہاں جناب معین شاہد نے مانپوری کی انشائیہ نگاری کو ان کا فطری عمل قرار دیا ہے اور ساتھ ساتھ مانپوری کی شاعری پر بھی گفتگو کی ہے۔

زیر نظر کتاب میں طنزیات مانپوری سے انتخابی متن کا آغاز ص ۷۹ سے ہوتا ہے اور ص ۲۷۱ تک پہونچتا ہے۔ اس حصے میں بالترتیب ''میر کلو کی گواہی''، ''کرایہ کی ٹم ٹم''، ''مرنے کے بعد''، ''ماما کی مصیبت''، ''میری اسیسری''، ''میونسپل الیکشن''، ''دوستی''، ''میری عید''، ''میرا روزہ''، ''سکنڈ ہینڈ موٹر''، ''ایڈیشنل وائف'' اور ''ہاتھی'' یعنی مانپوری کے بارہ مضامین نے جگہ پائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر مضامین معروف و مشہور ہیں اور پھر یہ کہ ''دیباچہ'' میں مرتب نے انہیں مضامین کے حوالے اور اقتباسات کے ساتھ گفتگو کی ہے جس سے ''دیباچہ'' اور ''حصہ انتخاب'' میں مفید تال میل کی کیفیت از خود پیدا ہوگئی ہے۔ کتاب کے آخری صفحہ ۲۷۲ پر ''انجم نامہ'' کا اندراج ہے جو اگرچہ بالکل غیر مفید ہر گز نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ ''دیباچہ'' میں سوانح کا حصہ آجانے کے بعد اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

اصولاً ایک مصنف یا مرتب اور ناشر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ املا اور انشا کے تعلق سے کتاب پڑھنے والوں کو دوران قرأت غیر ضروری تکدر سے دوچار نہ ہونے دے، مگر افسوس کہ بہت ساری اچھی کتابیں اس وصف سے محروم رہ جاتی ہیں اور یہ محرومی زیر تبصرہ تالیف کا حصہ بھی بن گئی ہے۔ اس کا آغاز رنگین سرورق پر ''باسمہ'' سے ہی ہو جاتا ہے اور پھر جگہ جگہ کمپوزنگ کی غلطیوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے مثلاً نبو کی جگہ ''بنو'' (ص ۱۷) رویے کی جگہ ''روئے'' (ص ۴۲) ''دوم کی پر اشاعت پر'' (ص ۴۳) اخلاقی کی جگہ ''اخلاق'' (ص ۴۴) نامسوع کی جگہ ''ناسموع'' (ص ۴۶) تعلی کی جگہ ''تعلے'' (ص ۵۵) اور ''کیاں'' کی بجائے ''کہاں'' (ص ۵۵) نیز اکثر مقامات پر لفظ کا حصہ ٹوٹ کر دوسری سطر میں چلا گیا ہے اور نہ صرف ۴۵ پر، مشہور اردو شعر کا پہلا مصرع وزن، قافیے اور ردیف سے چھوٹ کر، بے بسی کے عالم میں پڑا ہے اور ''میں نے'' کی جگہ ''زمانے میں'' آنے کا منتظر ہے بلکہ ص ۶۵ پر تو فردوسی کا مشہور شعر ہی پوری طرح خبط ہو گیا ہے اور ''نمیشرہ'' کی جگہ ''منیزہ''، ''ستم'' کی جگہ ''منم''، ''دخت'' کی جگہ ''دخت'' اور ''مدیرہ'' کی جگہ ''ندیدہ'' تک رسائی کی آس لگائے ثبت قرطاس ہے۔ یہ اشارات اپنی جگہ، مگر بحیثیت مجموعی یہ کہنا قرین انصاف ہے کہ مرتب نے اس کام میں بہر حال مخلصانہ محنت کی ہے اور یقیناً کتابی شکل میں، ان کی یہ محنت اہل نظر کی پزیرائی سے محروم نہیں رہے گی۔

نام کتاب	:	کلیاں کھلنے دو
مصنف	:	سہیل عالم
ناشر	:	آئیڈیل پبلی کیشن ہاؤس، کامٹی، مہاراشٹر
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۷۶
قیمت	:	۵۴ روپے
مبصر	:	زیبا پروین

بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''کلیاں کھلنے دو'' پیش نظر ہے، جسے سہیل عالم کی شعری کاوشوں کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے ان کی کتاب ''مسکراہٹ'' بچوں کی دنیا میں مقبولیت پا چکی ہے اور اب زیر نظر کتاب میں بھی اپنے سابقہ کامیاب تجربے کا سلسلہ انہوں نے آگے بڑھایا ہے۔

زیر نظر کتاب کا سرورق بہت پیارا ہے اور اس میں عنوان کی معنویت بڑے ہی حسن سے تجسیم کر دی گئی ہے۔ پہلے اندرونی سرورق پر صنعت توشیح میں ایک پیاری نظم ملتی ہے اور دوسرے اندرونی پس ورق پر ڈاکٹر محمد رفیق کے تاثرات درج ہیں۔ مناجات اور نعت و منقبت سمیت تیس نظموں پر مشتمل اس مجموعہ کا ''انتساب'' بجائے خود بہت ہی دردناک ہے، کیونکہ یہ ''ان بچیوں کے نام ہے'' جنہیں والدین کی سفاکی نے کتوں کی خوراک بنا دیا۔'' یہ بات دراصل اس ٹائیٹل نظم ''کلیاں کھلنے دو'' کے تناظر میں آئی ہے جو بقول مصنف:

> ''حالات حاضرہ پر ہے اور جس کا تعلق سماج کے ان تعلیم یافتہ اور ترقی پسند لوگوں سے ہے جنہوں نے ظلم میں عرب کے ان جاہلوں کو پیچھے چھوڑ دیا جو اپنی

PDF Compressor Free Version

بچیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔''

مذکورہ نظم اور انتسابی تحریر کی اہمیت و تاثیر اپنی جگہ، مگر یہاں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ بچوں کے کچے ذہن کی رعایت رکھتے ہوئے اگر یہ انتسابی سطر، کسی اور انداز سے رقم ہوتی تو اچھا ہوتا کہ والدین کی شفقت کے تئیں بچوں کے ذہن بھٹکنے کا سرے سے کوئی خدشہ نہ رہتا۔ بہر کیف یہ تو ایک ضمن بات ہے، جہاں تک مجموعی طور پر زیر نظر کتاب کا معاملہ ہے اس میں بہر صورت صفحہ انتساب کے بعد مصنف نے ''اپنی بات'' کے تحت بچوں کو ڈائری لکھنے کا جو مشورہ دیا ہے اور اس کے جو فوائد بتائے ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں، پھر بالترتیب ڈاکٹر مدحت اختر، آغا محمد، باقر نقی جعفری اور عارف جمال کی تحریریں سامنے آتی ہیں اور مصنف کی زندگی و خدمات اور خصوصاً اس کتاب کے حوالے سے بچوں کے لئے ان کی شاعری کے ضروری اور اہم فکری و فنی گوشے اختصار و اعتدال کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آئینہ ہو جاتے ہیں۔

کتاب کا شعری متن صفحہ ۱۶ سے شروع ہوتا اور اختتامی صفحہ ۷۶ تک پہونچتا ہے اور یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ یہاں سہیل عالم نے موضوع و مواد اور اسلوب کے اعتبار سے بہت کامیاب شاعری کی ہے۔

زیر نظر مجموعے کی نظموں میں ''جنت کی سیر''، ''سونے کی کھٹیا''، ''تتلی''، ''سردی آئی''، ''سنترہ''، ''ہمیں بچوا!''، ''امتحان سر پر ہے''، ''بچہ چاہے.....''، ''سہیل''، چھوڑو دادی''، چڑیا گھر''، ''چاچا نہرو''، ''پاگل خانہ'' اور ''زیور علم سے'' جیسی تخلیقات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان

نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے مترنم بحر اور دلکش آہنگ اپنایا ہے اور مشکل و ادق لہجے سے عموماً دامن بچاتے ہوئے اپنی باتیں کہی ہیں۔ پیامی نظموں میں انہوں نے اظہار عزم کے اسلوب سے کام لیا ہے اور بچوں میں احساس ذمہ داری کے تئیں ذہنی بیداری لانا چاہا ہے۔ شاعر نے اگر مقامی پھل ''سنترہ'' کے فوائد کو نہیں بھلایا ہے تو ''سہیل'' نامی ستارے کی خصوصیات سے بھی بچوں کو بخوبی آشنا کیا ہے۔

محنت سے چور ہو تو اسے کھا کے دیکھ تو
پل میں تکان ساری مٹاتا ہے سنترہ
مریضوں کو بخشے جو آرام بچو
سہیل اس ستارے کا ہے نام بچو

اس کتاب میں اگر ایک طرف براہ راست نصیحت کی بجائے، دوستانہ مشورے کا انداز اپنایا گیا ہے تو دوسری طرف حسب موقع ''سونے'' جیسے لفظ کو تجنیس تام کی صورت میں لا کر نظم کو عمدہ اور چونکا دینے والے کلائمکس کا حامل بنا دیا گیا ہے اور طرز تکلم میں فطری پن کا بہت بیساختہ اظہار کیا گیا ہے۔

فعل اور قول میں آئے نہ کبھی اپنے تضاد
خود کو یوں آئینہ کردار بنایا جائے
بہت خوبصورت سا تحفہ
مرے ابو لائے ہیں چاندی کا جھولا
کہا سن کے اک نے ہے اس میں عجب کیا
مرے گھر تو ہے ایک سونے کی کھٹیا
یہ سنتے ہی سب بولے سونے کی کھٹیا؟
ہمیں الو سمجھا ہے جھوٹا کہیں کا
گیا لے کے ہم سب کو اپنے مکاں پر
کہا مسکرا کر وہ دیکھو وہاں پر
مرے دادا سوتے ہیں اس پر ہمیشہ
یہ ہے میرے دادا کے سونے کی کھٹیا

مزید برآں یہاں مشاہداتی انداز میں بچوں کو ''چڑیا گھر'' کی سیر کرائی گئی ہے اور انہیں ''منظوم لطیفہ'' اور ''پاگل خانے کی سیر'' کا موقع دیا گیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ انہیں ''اردو زبان'' پر نظم سے اور ''کمپیوٹر'' کے بارے میں معلومات سے بھی محروم نہیں رکھا گیا ہے، جس کی اہمیت آج کے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے روشن ہے۔

PDF Compressor Free Version

یہ اردو زباں کوئی جب بولتا ہے
تو ہر لفظ کانوں میں رس گھولتا ہے

دیکھ سکیں اور جن چیزوں کو چھو پائیں
ہارڈویر وہ چیزیں بچو کہلائیں
دیکھ نہ پائیں اور نہ جن کو چھو پائیں
سافٹ ویر وہ چیزیں بچو کہلائیں

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں نانی اور دادی سے کہانی سننے کی خواہش رکھنے والے جو بچے ہیں، وہ بالکل آج کے ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر عہد کے بچے ہیں اور یہ سب جب نئے دور کی چیزوں کے نام لے کر اپنا مطالبہ رکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ پرانے دور کو فطری انداز میں نئے دور سے ملایا جارہا ہے۔

بچوں کا ادب زندگی کی تعمیر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور سنجیدہ ادبی حلقہ کی مبارکباد کے مستحق ہیں سہیل عالم جیسے فن کار جو اسے مضبوط بنائے رکھنے کی مخلصانہ جدوجہد میں مصروف ہیں اور عصری تناظر میں اپنا پیغام ''کلیاں کھلنے دو'' عام کررہے ہیں۔ خدا کرے یہ کتاب زیادہ سے زیادہ بچوں تک پہونچے اور انہیں زندگی و بندگی کی سچی راہیں دکھانے میں معاون بنتی رہے۔ ❁❁

آپ ہرن: عصر حاضر کا ایک المیہ (ص ۲۰ سے آگے)

ہے اور اس کو اپنے اندر جذب کر کے پوری فنکاری کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہنا کر تخلیق کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ بقول کلام حیدری:

''فن فنکاری کی دہلیز پر پکار پکار کر عالموں سے پوچھ رہا ہے کہ آپ حضرات کب باہر نکلیں گے اس تنگ و تاریک یا سجے سجائے کمرے سے اور باہر کا یہ منظر دیکھیں گے، یہ ہمارے عہد کا المیہ ہی ہے کہ تخلیق کار دہلیز پر کھڑا پکارتا ہی رہے گا، مگر سجے سجائے دانشوری کے آرام دہ کمرے سے باہر کوئی نہیں نکلتا کیوں کہ باہر نکلنے کے کچھ تقاضے اور Manners ہیں۔ ان کے Dress-up ہونے سے پہلے ہی دھوپ افشاں اڑاتی ہوئی غائب ہوجاتی ہے۔ عبدالصمد نے جو دیکھا اسے دانشور نہیں دیکھ سکا، کیوں کہ دانشور کے پاس آلات ہیں اور وہ آلات کو ہی استعمال کر کے کچھ دیکھ سکتا ہے، عبدالصمد کی طرح اس کے پاس جذب نہیں ہے۔'' (عبدالصمد کے منتخب افسانے، مرتبین محسن رضا رضوی، افسانہ خاتون، ص ۱۷ و ص ۱۸)

اس افسانے میں بالکل یہی صورت حال پیش آئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جس مسئلے کو ایک سماج کا محافظ نہیں سمجھ پارہا ہے اس کو ایک تخلیق کار ہی لوگوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ جس کی مثال یہ کہانی ہے جو ہمارے آج کے جھوٹے اور دکھاوٹی قانون و نظام کی آئینہ دار ہے جس میں کہیں نہ کہیں کرداروں کے پیچھے ہماری خود کی روداد اور روح کی تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ ❁❁

فلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔

اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تا کہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔

اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی فلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

گیا میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد

پٹنہ: گزشتہ دنوں 28 نومبر کو بہار اردو اکادمی کے اہم پروگرام ''اکادمی آپ تک'' کی تقریب کا شاندار انعقاد ہوا۔ مرزا غالب کالج، گیا کے مخدوم محی الدین ہال میں منعقدہ اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مگدھ یونیورسیٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اشتیاق نے کہا کہ اردو زبان کو اگر زندہ رکھنا ہے تو ہمیں اسے اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اپنانا ہوگا۔ نہیں تو یہ زبان دھیرے دھیرے اپنے دائرے میں سمٹ کر رہ جائے گی۔ ادبا و شعرا کو شہرت اور ایوارڈ کی پرواہ کئے بغیر اپنا کام کرتے رہنا چاہئے کیونکہ ان کا کام ہی ان کی پہچان ہے۔ موصوف نے مزید کہا کہ اردو اکادمی کا یہ کام قابل تعریف ہے کہ وہ بزرگ ادبا و شعرا کو ان کے ضلع میں ہی عزت افزائی کر رہی ہے۔ یہ کام سلسلے وار ہر ضلع میں ہونا ہے، یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ میں اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے اس عملی اقدام کی ستائش کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ اکادمی سکریٹری مشتاق احمد نوری نے اکادمی کا ایک نیا کام شروع کیا ہے جو ''اکادمی آپ تک'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے تحت ہر ضلع میں تین ادبا و شعرا کا انتخاب ہوگا جنہیں مومنٹو، توصیفی سند، شال کے ساتھ -/21000 (اکیس ہزار) روپئے کا نذرانہ بھی پیش کیا جائے گا، ساتھ ہی اس ضلع کے شعرا پر مشتمل مشاعرہ بھی ہوگا۔ ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کی شروعات گیا ضلع سے ہوئی جہاں جناب فرحتؔ قادری، جناب ناوکؔ حمزہ پوری اور جناب شاہد احمد شعیبؔ کی بہار اردو اکادمی کی طرف سے عزت افزائی کی گئی۔ وائس چانسلر پروفیسر محمد اشتیاق نے تینوں حضرات کو مومنٹو اور توصیفی سند پیش کی اور مشتاق احمد نوری سکریٹری اکادمی نے رقم اور شال پیش کیا۔

اس موقع پر پروفیسر افصح ظفر نے شاہد احمد شعیبؔ پر اپنا مقالہ پڑھا اور پروفیسر حسین الحق نے تقریر کی شکل میں اپنا خوبصورت مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے فرحتؔ قادری پر اپنا مقالہ پڑھا اور سید احمد قادری نے ان کے فن اور شخصیت پر تقریر فرمائی۔ جناب ناوکؔ حمزہ پوری پر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن خان نے اپنا مقالہ پیش کیا اور پروفیسر محمد محفوظ الحسن نے ان کی فن اور شخصیت پہ گفتگو کی۔

پروگرام کے شروع میں اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے اکادمی کے اس نئے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور مہمان ذی وقار و صدر مجلس پروفیسر محمد اشتیاق کے ساتھ تینوں ایوارڈیافتہ فن کار کے فن اور شخصیت پر مختصراً روشنی ڈالی۔ اس موقع پر گیا کے معزز ادبا و شعرا کافی تعداد میں موجود رہے۔ کالج کے پرنسپل کے علاوہ معصوم کاظمی، مسعود منظر، عین تابش، صدف اقبال اور اردو ہندی اخبار کے نمائندہ بھی موجود تھے۔

دوسری نشست میں مقامی شعرا پر مشتمل ایک مشاعرہ پروفیسر حسین الحق کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب ناوکؔ حمزہ پوری، فردوسؔ گیاوی، ندیمؔ جعفری، مرغوب اثرؔ فاطمی، شاہد اخترؔ، ہریندر گری شادؔ، اسلم سیفی، س۔ع۔ مقیتؔ، مناظر حسن شاہین، اعجازؔ مانپوری، احساسؔ گیاوی، صدف اقبالؔ، مہدیؔ گیاوی، تبسمؔ فرحانہ اور برکھا گپتا وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

سکریٹری کے شکریہ کے بعد یہ پروگرام اختتام کو پہونچا۔

PDF Compressor Free Version

پٹنہ کتب میلہ میں شاندار مشاعرہ

پٹنہ: گزشتہ ۱۲،نومبر کو گاندھی میدان کے کتب میلہ میں ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت وزیر اقلیتی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور نے فرمائی۔ انہوں نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ عظیم آباد ہمیشہ سے ہی شعروادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کی اہمیت ومرکزیت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے اور آج بھی یہاں کی ادبی اور شعری بہاریں سبھوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی مثالی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بہار اردو اکادمی نے کتب میلہ میں اپنی مطبوعات اسٹال لگایا ہے، کتابیں دل ودماغ کی بہترین غذا ہیں اور اہل بہار خصوصاً اہل عظیم آباد کی کتابوں سے محبت ہماری علمی وادبی اور ثقافتی روایت کا اٹوٹ حصہ ہے اور ہمارے لئے باعث فخر بھی۔ انہوں نے پر یقین لہجے میں کہا کہ وزارت اقلیتی فلاح کی سرپرستی میں بہار اردو اکادمی زبان وادب کے فروغ میں کافی معاون ثابت ہوگی اور بہار کی ہر ایک اردو لائبریری کو بھی اردو اکادمی سے جوڑا جائے گا اور ہر طرح سے اس کی امداد کی جائے گی۔ اس مشاعرے میں جناب سلطان اختر، جناب اعجاز علی ارشد، جناب عالم خورشید، جناب خورشید اکبر، جناب ابرار مجیب، جناب قاسم خورشید، جناب انور شمیم، جناب ظفر صدیقی، جناب پریم کرن، جناب کاظم رضا، محترمہ تحسین روزی اور جناب کامران غنی صبا نے شرکت فرمائی اور اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری کے شکریہ کے بعد یہ محفل اختتام کو پہونچی۔ اس موقع پر وزیر موصوف نے اردو اکادمی کے اسٹال کا بھی جائزہ لیا اور اپنی خوشی واطمینان کا اظہار کیا۔

دربھنگہ میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت محفل اعزاز اور مشاعرہ

پٹنہ: بہار اردو اکادمی پٹنہ کے ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت 13 دسمبر کو ملت کالج دربھنگہ میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد ہوا جس میں دربھنگہ کے تین بڑے شعرا اویس احمد دوراں، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی اور ذکی احمد کو اعزاز سے نوازا گیا۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری، پرو وائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین، ڈاکٹر محمد رحمت اللہ پرنسپل ملت کالج، ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسپل مارواڑی کالج کے ہاتھوں تینوں شعرا کو اکادمی کی جانب سے مومنٹو، توصیفی سند، شال اور اکیس اکیس ہزار روپے کا چیک دیا گیا۔

اس موقع پر پرو وائس چانسلر سید ممتاز الدین نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ملک میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کام کر رہی اردو اکادمیوں میں بہار اردو اکادمی سب سے متحرک ہے۔ بہار اردو اکادمی نے ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کے تحت ہر ضلع میں پہنچ کر وہاں کے بزرگ شعرا اور ادبا کو اعزاز سے نوازنا یقیناً ایک اچھی پہل اور لائق تعریف کاوش بھی ہے۔ انہوں نے جہاں ذکی احمد اور عبدالمنان طرزی کی شاعری کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ طرزی بڑے قادر الکلام شاعر ہیں وہیں اویس احمد دوراں کی شاعری کے متعلق بتایا کہ میں نے مجروح سلطان پوری جیسے شاعر کو ان کی شاعری کا دلدادہ دیکھا ہے انہوں نے ان کی نثر کو بھی خوشونت سنگھ کی نثر کی طرح مربوط نثر قرار دیا۔ صدر تقریب نے طلبہ وطالبات کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا کہ آپ ایسی ترقی کریں کہ ملت کو آپ پر فخر ہو اور لوگ ہماری ملت کی طرف عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور آپ ملک کو درپیش مسائل کے حل کرنے میں اہم کردار نبھائیں۔

اس موقع پر اعزاز سے نوازے گئے مذکورہ شعرا کی حیات وخدمات پر ایک ایک مقالہ اور تاثراتی خطبہ پیش کیا گیا۔ اس موقع پر عطا عابدی نے اویس احمد دوراں کی فنکاری اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شاعری وشخصیت ایک دوسرے کا آئینہ ہے۔ آپ ان کی شاعری میں ان کی بھرپور شخصیت ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کی شخصیت میں ان کی شاعری کے مختلف پہلو آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دوراں کی بہت سی

PDF Compressor Free Version

غزلیں جہاں نظم کی فضا کا احساس کراتی ہیں وہیں مختلف موضوعات کے حوالے سے نہ صرف اپنے وجود کی معنویت پیش کرتی ہیں، بلکہ ایک خاص قسم کی توانائی کا بھی ثبوت دیتی ہیں۔اس موقع پر سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر رئیس انور رحمٰن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اویس احمد دوراں یوں تو ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے پروپیگنڈہ اور نعرہ بازی یا مریضانہ انداز کی اشتراکیت سے بچتے ہوئے شاعری کی۔ان کی نظمیں بھی ملتی ہیں اور غزلیں بھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی نظمیہ کیفیت ہے یعنی ہم آہنگی اور تسلسل خیال ملتا ہے۔مجموعی طور پر اگر ان کی شاعری کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا جائے تو احساس ہوگا کہ وہ مشہور فنکار شاعر فیضؔ سے قریب تر ہیں۔ان کے یہاں اشتراکیت، حقیقت اور ساجیت بھی ہے اور رومانیت اور جمالیت بھی اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

ذکی احمد چندن پٹوی کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد نے اپنے مقالہ میں کہا کہ ان کی شاعری کو ہسار تخیل سے پھوٹا ہوا وہ چشمہ ہے جو حیات انسانی کے ساحل رنج وغم اور انبساط فخر سے ٹکراتے ہوئے اپنا سفر طے کرتی ہے اور سمندر میں مل کر بھی اپنے قطرہ ہونے کا احساس کراتی ہے۔ان کی نظمیں زندگی کے واقعات اور کشمکش کو محیط ہیں جو انسانی فطرت اور احساس زندگی کا اہم جزو ہے۔پروفیسر شاکر خلیق نے کہا کہ ذکی احمد فطری اور جنوین شاعر ہیں۔ سادگی اور سلاست ان کے فن کا طرہ امتیاز ہے۔زندگی کے تلخ وشیریں میں تجربات سے ان کی شاعری کا تانا بنتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی شخصیت اور شاعری پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے احتشام الحق نے کہا کہ عبدالمنان طرزی غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں۔دونوں میں ان کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں، لیکن انہوں نے منظوم تنقید، منظوم مقالے، منظوم تبصرے اور منظوم تذکرہ کی جو بنیاد ڈالی ہے ان سے ان کا شاعرانہ قد ہی نہیں بڑھا ہے بلکہ اردو ادب کو نیا موضوع اور نیا تجربہ بھی ملا ہے۔مجیر احمد آزاد نے ڈاکٹر طرزی کے حوالے سے کہا کہ وہ نئی نسل کے قلم کاروں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور ان کی ترقی اور ناموری میں حصہ دار بھی بنتے ہیں۔

پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے اور نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے سکریٹری بہار اردو اکادمی مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اس سے قبل بہار اردو اکادمی پٹنہ اکادمی بن کر رہ گئی تھی، لیکن میں نے یہ پہل کی ہے کہ ایسے شعرا جن کی بڑی ادبی خدمات رہی ہے اور اب وہ عمر کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ان کے گھر تک پہنچ کر اکادمی ان کی خدمات کا اعتراف کرے اور انہیں اعزاز سے نوازے۔گیا کے بعد دربھنگہ میں یہ دوسرا پروگرام ہے۔اسی طرح اکادمی ریاست کے تمام اضلاع تک پہنچے گی اور وہاں کے شعرا کو نوازے گی۔ابتدا میں ملت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے پروگرام کی صدارت کر رہے متھلا یونیورسیٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین اور اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کو گلدستہ دے کر استقبال کیا۔اس موقع پر مہمانان کے ہاتھوں احتشام الحق کی مرتبہ کتاب ''طرزی اور طرز سخن'' صدر ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی کتاب ''دیدہ وران بہار'' جلد چہارم اور ابرار مجیب کی کتاب ''رات کا منظر نامہ'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

اس موقع پر اردو اکادمی کی جانب سے دوسری نشست میں ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی صدارت میں مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر شاکر خلیق، پروفیر اویس احمد دوراں، نیاز احمد سابق اے ڈی ایم، ڈاکٹر ایم کمال الدین، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر عبدالقیوم ساقیؔ، عطاؔ عابدی، منور عالم راہیؔ، علاء الدین حیدر وارثیؔ، آرزوؔ نسنوی، رفیق انجم، فاروق اعظم انصاری، منظر ریوندھوی، فردوسؔ علی ایڈووکیٹ، عرفان احمد پیدلؔ، جنید عالم آرووی، منظرؔ صدیقی، انام الحق بیدار، خونؔ چندن پٹوی، ندؔا عارفی، صباؔ در بھنگوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر مجیر احمد آرزوؔ نے کی۔مذکورہ دونوں نشستوں میں ڈاکٹر ایس ایم جاوید اقبال، ڈاکٹر احتشام الدین، ڈاکٹر جمال اویسی، اظہر نیر، ڈاکٹر ایوب راعین، نظر عالم، ڈاکٹر عالمگیر شبنمؔ، عطاء الرحمٰن، شکیل احمد سلفیؔ، افلاک منظر، ڈاکٹر عقیل صدیقی، ڈاکٹر محمد بدرالدین، محمد ساجد اقبال، زاہد انور، محمد شمشاد وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات اور دانشوران نے شرکت کی۔ڈاکٹر مشتاق احمد نوری کے کلمات سپاس پر دونوں تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' کا دسمبر کا شمارہ مل گیا تھا۔ اکادمی میں محترم قاضی عبدالستار صاحب کی آمد اور ان کے استقبال کی تحریر و تصویر دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ قاضی صاحب ہر اعتبار سے اعزاز کے مستحق ہیں۔ آپ نے اس موقع پر بہار کے تمام عمدہ فکشن نگاروں کو جمع کیا۔ یہ بھی بہت اچھا عمل ہے اور آپ کے اداریہ میں پڑھا کہ آپ لوگوں نے ''اکادمی آپ تک'' جیسا سلسلہ شروع کیا ہے اور گیا جا کر فرحت قادری، ناوک حمزہ پوری اور شاہد احمد شعیب کی عزت افزائی کی، تو جی خوش ہو گیا۔ یہ بہت ضروری تھا ورنہ ہم اپنے بزرگوں کو بھولتے جا رہے ہیں، ان کے احترام اور خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہے۔ میں آپ کو اور آپ کے رفقا کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ایسا تبھی ممکن ہوتا ہے جب علمی ادارے پڑھے لکھے انسانوں کے ہاتھوں میں آئیں ورنہ وہی حال ہوتا ہے جو ان دنوں دیگر اکادمیوں کا ہو گیا ہے۔ دراصل سیاست داں نہیں چاہتے کہ پڑھے لکھے لوگ منظر میں آئیں، لیکن نتیش کمار کے بارے میں ایسا کہہ پانا مشکل ہے۔ آپ کی ادارت میں رسالہ نے شکل و صورت بدلی ہے، معیار بھی بدلا ہے، لیکن ابھی بھی وہ بہار سے باہر نہیں نکل پا رہا ہے۔ اس کے لئے صرف آپ ہی نہیں ہم لوگ بھی قصوروار ہیں۔

(پروفیسر) علی احمد فاطمی، الٰہ آباد

☆ آپ کے فنکارانہ شعور اور جمالیاتی وفور کی کرشمہ سازیاں سامنے ہیں۔ آپ کی دانشورانہ ہنرمندیاں کیسے کیسے گل کھلاتی ہیں۔ ''زبان و ادب'' کے گزشتہ شماروں کے حسن صوری اور رفعت معنوی سے متاثر ہو کر چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

جمالِ یار کا ہے ترجماں زبان و ادب
ورق ورق ہے کوئی گلستاں زبان و ادب
علوئے فن کی ہیں گر کمیتیاں زبان و ادب
تو لفظ و معنی کی شادابیاں زبان و ادب
ادیب و شاعر و افسانہ گر کی تخلیقیں
کہ حسن عصری کی ہے کہکشاں زبان و ادب
تنانِ فکر ہیں رنگیں قبا میں یوں ملبوس
انہیں کی ساری ہیں طنازیاں زبان و ادب
سلیقہ کہئے اسی کو جناب نوری کا
کسی حسین کی انگڑائیاں زبان و ادب
کچھ اس طرح سے سنوارا، نکھارا ہے اس کو
غرورِ حسن کا ہے آستاں زبان و ادب
جمالِ فکر و نظر کی بساط سی ہے بچھی
وفورِ معنی کی تہہ داریاں زبان و ادب
ہر ایک صفحہ ہے خوشبو کسی کے گیسو کی
تو چشمِ یار کی بینائیاں زبان و ادب
ہر اقتباس ہے آئینہ حسن جاناں کا
نگاہِ شوق کی حیرانیاں زبان وادب
جو عام رند ہیں اُن کی تو بات جانے دیں
جنابِ شیخ کی سرمستیاں زبان و ادب
چلو کہ پی لیں ذرا آج دست نوری سے
کہ اہل علم کی مئے خواریاں زبان و ادب

(پروفیسر) عبدالمنان طرزی، دربھنگہ

☆ ''زبان وادب'' کا شمارہ دسمبر ۲۰۱۵ء دستیاب ہوا۔ شکریہ! مشمولات پر ایک سرسری نگاہ سے ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ گذشتہ شمارے کی طرح پیش نظر شمارہ بھی ادبی لحاظ سے وقیع اور معیاری ہے اور مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ آپ کی ادارت میں ''زبان وادب'' اب بہار کی سرحدوں سے نکل کر نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر مقبول ہو رہا ہے۔ سرکاری اداروں کے رسائل و جرائد کے متعلق یہ عام رائے قائم ہے کہ اس میں محض

PDF Compressor Free Version

خانہ پری کے مواد ہوتے ہیں، لیکن ''زبان وادب'' کے پیش نظر شمارے میں پروفیسر طارق جمیلی، شموئل احمد، پروفیسر غضنفر علی اور راشد انور راشد کی تخلیقات کی شمولیت اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے پیش نظر ''زبان وادب'' کے معیار و وقار کو بلندی بخشنا ہے، جس کا اظہار آپ نے ''حرف آغاز'' میں کیا ہے۔ بیشک کسی بھی رسالے کے وقار کی ضامن معیاری تخلیقات ہی ہوتی ہیں۔ پروفیسر طارق جمیلی صاحب جیسے بزرگ اور جید عالم کا مضمون ''شاعر با کمال: شمس جلیلی'' دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نمونہ ہے۔ راشد انور راشد نے قاضی عبدالستار کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر قمبر علی خاں کا مضمون بھی بھرپور ہے۔ مشہدی صاحبہ پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ شموئل احمد جیسے صحت مند فکر و نظر کے فکشن نگار کی تخلیق کی شمولیت قارئین ادب کے لئے باعث مسرت ہے۔ افسانے کے باب میں ڈاکٹر اختر آزاد، اقبال حسن آزاد اور مہر افروز کے افسانے موضوع اور ٹریٹمنٹ دونوں ہی لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔ پروفیسر غضنفر علی ان دنوں خاکہ نگاری کو چار چاند لگانے میں لگے ہیں۔ پیش نظر شمارہ میں ان کا خاکہ ''وہ جو میرا تیرا حبیب تھا'' ان کی منفرد طرز تحریر کا نمونہ ہے۔ شاعری کے باب میں قوس صدیقی، جمال قدسی، راشد جمال فاروقی اور ظہیر انور کی غزلیں خوب ہیں۔ ظہیر انور کا یہ شعر غزلیہ شاعری کی شناخت کو مستحکم کرتا ہے۔

مرا ضمیر مری خواہشوں کا قاتل ہے
میں اپنے آپ سے لڑتا ہوں جنگجو کی طرح

تبصرے کے باب میں پانچ کتابوں کا تعارف اور اس کی علمی و ادبی قدر و قیمت کا تعین رسالے کی ضخامت کو بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ قارئین ادب کو جہان نو سے واقف کرانے کی قابل قدر کوشش ہے۔ حصہ برائے اطفال کے صفحات میں اضافے کی ضرورت ہے، کیونکہ اب دنیائے اردو میں بچوں کے رسائل کا فقدان ہمارے لئے باعث تشویش ہے۔ نئی نسل کو اردو سے جوڑے رکھنے کے لئے ان کی دلچسپی کے مضامین کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اکادمی مشاعرہ کے شعرائے کرام کا البم بھی خوب ہے۔ مشاعروں اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات تو آپ نے ''ہماری سرگرمیاں'' کے باب میں دے ہی دی ہے۔ یہ سلسلہ بھی بہتر ہے۔ مجموعی اعتبار سے پیش نظر شمارہ آپ کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

(ڈاکٹر) مشتاق احمد، دربھنگہ

☆ مجلّہ ''زبان وادب'' کے دسمبر ماہ کا شمارہ ایک خوبصورت عمارت کے دلکش منظر کے سرورق کے ساتھ منظر عام پر حسب معمول مکمل آب و تاب کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر اختر آزاد کے افسانے ''شہادت والی انگلی اور ٹریگر'' میں کلائمکس Climax کو جتنا موزوں کہا جائے گا، اتنا ہی نا مناسب اور غیر ضروری اس کے اینٹی کلائمکس کو گردانا جائے گا، کیونکہ اس میں ہیرو تو بیچارے بے قصور ڈاکٹر کو ہی گولی سے اڑا دیتا ہے۔ اس اختتام کا کوئی بھی واجب جواز نہیں بنتا ہے۔ اقبال حسین صاحب کے افسانہ ''پھول کھلنے دو'' میں واقعات کا ارتقا نہایت قدرتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا عنوان بھی 'پھول' کے اولاد کے لیے ایک نہایت موزوں مظہر ہونے کے موجب لائق صد ستائش ہی ٹھہرتا ہے۔ مہر افروز صاحبہ کے افسانے ''سیپنوں کے قاتل'' کے اول صفحے (نمبر ۳۳) پر مسلمانوں کے عدم تعصب کی بابت غیر جانبدارانہ بیان قابل احترام واقع ہوا ہے۔ اس افسانے میں میڈیکل ڈاکٹروں کی کم علمی کا خمیازہ عوام کو بھگتنے کی دور حاضر کی ناانصافی کی لعنت ملامت کرنا بلا التزام ہی گردانا جائے گا۔ نور العین ساحرہ کے افسانے زیر عنوان 'آخری کہانی' کے تحت ایک عورت کی داستان اسی کی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ اس میں شہوت پسند بیشتر مردوں سے ہی اپنا انتقام لینے والی ایک عورت کی بغاوت کو عام تجسیم و ترسیل کی خاصیت سے مزین کر کے رکھ دیا گیا ہے، اور یہ شاید اس لیے تاکہ صدیوں سے عورت ذات کے سینے میں

PDF Compressor Free Version

دہک رہی دوزخی نمرودی آتش کو بجھایا جا سکے۔اسی طرح غزالہ پروین کے افسانے ''ساتھ کا احساس'' میں گائے جیسے بھولے بھالے جانوروں سے ممتا و ہمدردی کا واجب اظہار قابل مدح ہے۔اس میں سخت مزاج ہیرو کے دل کا گداز ہو جانا یک لخت ہو کر بھی اس کا یہ احساس ندامت دیکھنے والا ہے اور اس کا یہ مقولہ ہے کہ ''بچھڑا صرف گائے کا ہوتا ہے اور بچہ دونوں کا'' (ص ۴۵) یعنی والدین کا۔سنسکرت زبان میں لفظ ''وتس'' (Vals) کا معنی ہے بچہ اور اسی سے بچھڑا، لفظ بھی بنتا ہے۔اتنے بلند پایہ شمارے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔مجلّہ ''زبان و ادب'' کے نومبر ماہ کا شمارہ بھی ملا تھا۔طلوعِ آفتاب کے خوبصورت معنی خیز منظر کے سرورق کے ساتھ منظر عام پر حسب معمول مکمل آب و تاب کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔اس میں نئے مدیر جناب مشتاق احمد نوری کا بصد احترام خیر مقدم ہے۔ایک الگ ضمن میں ہونے کے باوصف یہ شعر محولہ کر رہا ہوں۔

تم جو آئے ہو تو شکل در و دیوار ہے اور
کتنی رنگیں مری شام ہوئی جاتی ہے

نیز میں نے پہلی بار ہی کسی اداریے میں گزشتہ شمارے میں شامل افسانوی حصے کی بابت اتنی مختصر اور معیاری تنقید دیکھی ہے، جو کہ قابل صد مدح ہے۔کاش تمام جرائد کے مدیر صاحبان بھی اسی طرح سے پچھلے شمارے کی، چند مشمولات کے بارے میں ہی سہی، اپنے بے بہا ردِ عمل سے روشناس کرایا کریں تو ناقدوں و تخلیق کار ادبا کے تئیں کتنا حوصلہ افزا و مددگار قدم ہو، لیکن ہمیشہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔اس شمارے میں ہما فلک کے افسانے ''اگر'' میں ازدواجی حیات میں بقول دیگر مراسلہ نگاروں کے، میاں بیوی کی روزمرہ کی نوک جھونک تو ہے ہی، اس کے ساتھ ہی بیوی یہی کے ہی نظریے سے عموماً تمام تر خاوندوں کو برانچ لائن سے اپنی مین لائن پر لانے اور ان کے غیر ضروری غصے و غضب پر قابو پانے کے ایک سبق آموز طریقۂ کار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔یعنی بموجب عنوان ''اگر'' ایک بیوی مطلق جھک کر اپنے خاوند کو کسی طفل کی مانند پیار سے پلوستی ہے، تب اس کا سارا غصہ ایک دم ہوا ہو جایا کرتا ہے۔واہ مزہ آ گیا! کیسے نفسیاتی موضوع کو کس ہیئت سے قلم بند کیا گیا ہے! مایا مریم کے افسانے ''نیا در بچہ'' میں شاید پہلی بار ہی بیویوں کے نظریے سے ان کی از خود و خاوندوں کی نفسیات کو طنزیہ انداز میں نشان زد کیا جا سکا ہے۔نئے مدیر صاحب نے اپنے اداریے میں کیے گئے تبصرے کے تحت فقط ایک ہی صفت لفظ 'چنچل' کے توسط سے مکمل افسانے کو ''کوزے میں سمندر'' ضرب المثل کے بموجب مقید کر کے رکھ دیا ہے۔اگر اس نفسیاتی افسانے کے مطالعے سے چند بیویوں کو اپنے خاوندوں سے بعید دوسرے مردوں کے ساتھ بھی کھل کھیلنے اور انہیں بیوقوف بنانے کی تربیت و ترغیب ملے، تو اس افسانے کا فقط یہی ایک منفی نکتہ تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن اسی میں تو اس کا فنی تنوع و حسن ہے۔افسانے کا کلائمکس از حد معنی خیز اور فنی صلاحیت و مقصدیت سے آراستہ و پیراستہ واقع ہوا ہے اور لائق صد ستائش بھی ہے۔متذکرہ بالا دونوں افسانوں کی اشاعت کے لیے دلی مبارک باد و تہنیت!

کرشن بھاؤک، پٹیالہ

☆ یکم دسمبر ۲۰۱۵ء کے اخبار ''پندار'' میں یہ خبر پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ نے بہار اردو اکادمی کے پلیٹ فارم سے ایک نیا پروگرام ''اکادمی آپ تک'' حال ہی میں شروع کیا ہے۔جس کے تحت آپ اردو زبان کے بزرگ شعرا و ادبا تک پہنچ کر ان کی خدمت میں مومنٹو، توصیفی سند، شال اور بیس ہزار کی رقم بطور نذرانہ پیش کریں گے۔آپ ہر ضلع سے تین شعرا و ادبا کا انتخاب کریں گے اور ان کی خدمت میں یہ سامان اعزاز پیش کریں گے۔یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ اس اہم پروگرام کا آپ نے نہ صرف اعلان کیا بلکہ اس کو کر کے دکھا دیا اور عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔اس پروگرام کے تحت آپ نے اس کا آغاز گیا کی سرزمین سے کیا اور وہاں کے تین نامور حضرات ناوک حمزہ پوری، فرحت قادری، شاہد احمد شعیب کو اعزاز سے نوازا اور ان کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا۔یہ آپ نے

PDF Compressor Free Version

بڑا اچھا کام کیا۔ اس خدمت سے گیا کے مذکورہ شعرا و ادبا کو جس قدر خوشی و مسرت حاصل ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کوئی بزرگ شاعر و ادیب ہی کر سکتا ہے، جو اخیر عمر میں اپنی خدمات کی پذیرائی کے لئے پر امید ہو جو اس کا حق بنتا ہے۔ میں اس کے لئے آپ اور ذمہ داران بہار اردو اکادمی کو اپنی اور ''رابطہ ادب اسلامی، بہار'' پٹنہ کی طرف سے تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ایک اچھے کام کی شروعات کی ہے جو اکادمی جیسا سرکاری ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ یہ کام ہر لحاظ سے قابل تعریف اور لائق تحسین ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس سے ملک کے دوسری اکادمیاں بھی سبق حاصل کریں گی اور اپنے اپنے صوبوں میں یہ سلسلہ شروع کریں گی۔ اس طرح ملک کے لائق و فائق شعرا و ادبا کی علمی پذیرائی اور قدر دانی ہوگی۔

(ڈاکٹر) محمد عتیق الرحمٰن، پٹنہ

☆ ''زبان و ادب'' کا تازہ شمارہ (دسمبر ۲۰۱۵ء) نظر نواز ہوا۔ اندرونی سرورق اور پس ورق پر، آپ نے بہت ہی حسن کے ساتھ ''ایک شام قاضی عبدالستار کے نام'' اور ۱۳، اکتوبر کے اکادمی مشاعرے کی تصویریں سجادی ہیں۔ اس بار ''حرف آغاز'' آپ کے تازہ عزائم کی پر مسرت خبریں دے رہا ہے۔ ''اکادمی آپ تک'' بیشک اپنی نوعیت کا منفرد پروگرام بھی ہے اور مفید بھی۔ پھر آپ نے خواتین فنکاروں پر مشتمل پروگرام، عالمی فکشن سمینار، ریسرچ اسکالرز ورکشاپ اور عالمی صحافت سمینار کے منصوبہ بند انعقاد کا جو عزم ظاہر کیا ہے، وہ یقیناً آپ کی بلند نگاہی اور بلند ہمتی کے ساتھ آپ کے اخلاص کی دلیل ہے۔ وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور، بہار کی اردو لائبریریوں کو ایک خاص اہتمام کے ساتھ پر بہار بنانے اور اکادمی سے جوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ بھی بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔ عصمت اور بیدی، فکشن کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، ان پر مذاکرات و سمینار سے یقیناً بڑے فائدے ہوں گے۔ آپ نے ضخیم افسانہ نمبر نکالنے کی خوش خبری دی ہے، خدا کرے فکشن قلم کاروں کا حسب روایت تعاون اسے مثالی بنا دے، بس ابھی سے انتظار ہی انتظار ہے۔ مقالات کے حصے میں جہاں ایک طرف ''علم نجوم'' کے حوالے سے شوکل احمد کے ''برج حمل'' نے خاصی معلومات بخشا، وہیں ''قاضی عبدالستار کے موجودہ شب و روز'' پر راشد انور راشد کی تحریر نے بھی نئی اور اہم معلومات سے نوازا۔ حضرت شمس جلیلی پر پروفیسر طارق جمیل کا مضمون بہت پسند آیا، بیشک وہ ''شاعر باکمال'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر قنبر علی نے ''ذکیہ مشہدی کا افسانوی سروکار'' بڑے بھرپور انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ افسانوں کا حصہ اور ''خاکہ'' تو ابھی پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے، البتہ ''منظومات'' کے تحت پروفیسر عبدالمنان طرزی کا عطیہ ''شاہنامہ فردوسی کی ادبی اہمیت'' بہت ہی جامع ہے۔ اسے ''منظوم مقالہ'' کہنا بالکل بجا ہوگا۔ غزلیہ مشمولات بھی معیاری ہیں اور کتابوں پر تبصرے بھی خاصی دیانت اور متانت سے کئے گئے ہیں۔ ''ہماری سرگرمیاں'' کے اوراق اکادمی کی فعالیت پر گواہی دے رہے ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' بھی نہایت اچھی شعری و نثری تخلیقات سے آراستہ ہے۔ سبھی قلم کاروں کو مبارکباد۔ اس سے قبل ''زبان و ادب'' نومبر ۲۰۱۵ء بھی ملا تھا۔ رسالے کے توسط سے جہاں ایک طرف حالیہ مشاعرے کی تصویریں دیکھنے کو ملیں اور تقریب کی تفصیلی خبر میں شاعروں کے منتخب اشعار پڑھ کر خاصا لطف آیا وہیں رسالے کے مشمولات نے بھی دامن دل کھینچ لئے۔ ''حرف آغاز'' کیا ہے، گویا آپ نے اس تازہ شمارے کے بارے میں سارے برجستہ تاثرات سپرد قرطاس کر دئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی مبالغہ نہیں، کوئی خلائی دعوے نہیں، میں دست بہ دعا ہوں کہ اکادمی، آپ کے دور میں تیزی سے آگے بڑھتی رہے۔ آزاد غزل پر جناب عابد سہیل کا مقالہ واقعی لمحہ فکریہ مہیا کر رہا ہے۔ میرے خیال سے، جہاں تک شاعری کے سفر کا رخ نثر کی جانب ہونے کا سوال ہے، اس کے خاموش اشارات سے انکار آسان نہیں۔ پروفیسر قمر جہاں نے ''ناولٹ: صنف اور ہیئت کی تعبیر'' پر بہت سنجیدگی اور استدلال پسندی سے روشنی ڈالی

PDF Compressor Free Version

ہے۔واقعی ''فن کی تفہیم اس کے مزاج ومعیار کی پرکھ کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔'' اور موصوفہ نے اپنے اس مضمون میں جو ناولٹ سامنے رکھے ہیں، ان پر اس لحاظ سے تنقیدی احتساب کا بڑی حد تک حق ادا کر دیا ہے۔ عظیم آفاقی فن کاروں کے یہاں ''انسانیت'' کی باتیں اور اس کے پیام قدر مشترک کا درجہ رکھتے ہیں۔ڈاکٹر منظر اعجاز کا مضمون خسرو اور کبیر کے حوالے سے اس عقیدے کو راسخ بھی بناتا ہے اور مطالعہ کی تازہ مسرت وبصیرت سے بھی نوازتا ہے۔ ڈاکٹر شکیب ایاز کی تہذیبی شخصیت پر ڈاکٹر نسیم اختر کا مقالہ بھی بہت ہی بھرپور ہے۔ ''افسانے'' کے تحت اس شمارے کے تمام مشمولات کامیاب ہیں اور مختلف انداز سے نفسیاتی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ مایا مریم نے اگرچہ ذرا پیا کی سے ''نیا دریچہ'' کھول دیا ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ کہانی شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور عورت ذات کے خاموش کرب دروں سے آگاہی دیتی ہے۔ یہاں ''بابر بہ عیش کوش'' والی بات عورتوں کی طرف سے ہے، مگر یہ مردوں کے عمل کا نفسیاتی ردعمل بن کر آئی ہے اس لئے انہیں دعوت فکر بھی دے جاتی ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد کا انشائیہ ''قصہ بھوندو لال کے پروفیسر ہو جانے کا'' بڑے عبرتناک سماجی وتعلیمی المیے دکھا جاتا ہے، وہ اس صنف سے انصاف میں کامیاب ہیں۔ ''منظومات'' کا حصہ بھی بڑا ہی شاداب ہے۔ ''کتابوں کی دنیا'' میں مبصرین نے بڑی متانت سے اپنا مطالعہ نذر قارئین کیا ہے جو یقیناً مطبوعات کے وزن ووقار کو سمجھنے میں معاون ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی دلچسپ اور تربیتی ومعلوماتی رُخ سے نہایت کامیاب ہے۔

(ڈاکٹر) شائستہ انجم نوری، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ (دسمبر ۲۰۱۵ء) ہمارے ہاتھ میں ہے اس کی تعریف کرنی گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ رسالہ دیدہ زیب ہے۔ خوشنما کور، کمپوزنگ، طباعت صاف ستھری اور ہر لحاظ سے معیاری ہے ہر اچھی چیز خود بتا دیتی ہے کہ میرے اندر کیا کیا خوبیاں ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ع

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

یقیناً آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ڈاکٹر) سید اشرف اسمٰعیل، صادقپور ہاؤس، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ملا بہت بہت شکریہ، آپ لوگوں کی نئی ٹیم کے آنے سے رسالے میں صحت وتازگی اُبھر کر آئی ہے۔ خدا کرے یہ مزاج ومعیار سلامت رہے اور رسالہ زبان وادب کی نمائندگی کرتا رہے۔

راشد طراز، مونگیر

☆ ''زبان وادب'' کا نومبر کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اس میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ اس کے خوشگوار مستقبل کی کہانی کہہ رہی ہیں۔ اردو کو گنگا جمنی تہذیب کی جامن کہا جاتا ہے، مگر آپ نے اس کا حلقہ اور بڑھا دیا ہے کیونکہ تازہ شمارے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کراچی، ابوظہبی، ہانگ کانگ جرمنی کے قلم کار بھی شامل ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو یہ ایک بین الاقوامی پرچہ بن جائے گا۔

کرشن پرویز، موہالی

☆ ''زبان وادب'' ماہ اکتوبر اور نومبر ۲۰۱۵ء کے شمارے خاص طور پر سرورق کی خوبصورتی کے اعتبار سے انفرادیت رکھتے ہیں۔ آپ کا رسالہ بابت ماہ دسمبر ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ نومبر کے شمارے میں افسانے ''اگر'' اور ''بے راہ موڑ'' اور کچھ منظوم مواد پڑھ پایا ہوں۔ یہ دونوں افسانے عمدہ ہیں جب کہ کمپیئر اینڈ کنٹراسٹ کے مطابق ''بے راہ موڑ'' اپنی شناخت بنانے میں یکتا ہے۔ اس میں ''زبان اور بیان اپنی الگ امیج رکھتا ہے۔ اختتامیہ کا جملہ بے حد تاثر کن ہے۔ تبدیلی کسی بھی قسم کی ہو، اپنے آپ میں بہاؤ اور پھیلاؤ لاتی ہے۔ آپ کی دیکھ ریکھ میں رسالہ خدا کرے بہت آگے تک جائے۔ ذاکرہ شبنم کی نظم ''سوکھا پھول'' بہت اچھی لگی۔ مدراس کے علیم صبا نویدی کی تینوں غزلیں معیاری ہیں۔ صبا نقوی کی غزلیں بھی عمدہ ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں ''ریل'' نظم کا جواب نہیں۔ ریل کے ذریعہ عصری ضرورت پر حافظ کرناٹکی صاحب نے زور دیا ہے۔ جس کی اس

PDF Compressor Free Version

وقت ہمارے وطن عزیز کو اشد ضرورت ہے۔

صادق علی انصاری، سیتاپور، یوپی

☆ نومبر ۱۵ء کا شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اچھے قلم کاروں کی شمولیت نے اس کے وزن و وقار کو بلندی عطا کردی ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ امید ہے آپ لوگوں کی ادارت میں اس کا معیار اور بلند ہوگا۔ اس شمارے میں عابد سہیل اور ڈاکٹر قمر جہاں کے مضامین بے حد اہم ہیں۔ مایہ مریم کا افسانہ ''نیا در یچہ'' اور شہاب دائروی کا ''نیا تماشہ'' دل کو چھو گئے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد کا انشائیہ ''قصہ بھوندولا کے پروفیسر ہوجانے کا'' خوب رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حقیقت کو انشائیے کا رنگ عطا کردیا ہے۔ اس بار کا شعری حصہ بھی خوب سے خوب تر ہے۔ خدا کرے آئندہ بھی یہ اسی آن، بان اور شان سے منظر عام پر آتا رہے۔

ڈاکٹر قیام نیر، مدھوبنی

☆ ''زبان وادب'' ہر ماہ باقاعدہ مطالعے میں رہتا ہے۔ نومبر ۲۰۱۵ء کا شمارہ زیر نگاہ ہے۔ مذکورہ شمارے میں عابد سہیل کا مقالہ جامع مگر تشنہ ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز کا مقالہ ''خسرو اور کبیر: ہیومنزم کے تناظر میں'' لائق مطالعہ ہے۔ فکیب ایاز سے متعلق نسیم اختر کا مقالہ بھی لائق تحسین ہے۔ افسانوی حصے میں سرحد پار سے نورالہدیٰ سید کا افسانہ ''مورث پھڑکن'' پسند آیا۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد کا انشائیہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ شعری حصے میں شنکر کیموری کا نعتیہ کلام پسند آیا۔ غزلوں میں علیم صبا نویدی، صبا نقوی اور ڈاکٹر نسیم اختر نے متاثر کیا۔ ادبی حیثیت سے ''بچوں کا زبان وادب'' بھی قابل تعریف ہے۔

مصباح الدین طارق، گیا

☆ ''زبان و ادب'' کا نومبر ۲۰۱۵ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بلاشبہ ''زبان وادب'' کی صورت لگاتار بہتر سے بہترین ہوتی جارہی ہے۔ ہر ماہ نئے تجربے سے اس کی اہمیت وافادیت مزید بڑھتی جارہی ہے۔ اس میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا بڑا دخل ہے۔ آپ کے یہ تجربے یقیناً ہمارے لئے معاون ثابت ہورہے ہیں اور اچھوتے مضامین کے ذریعے ہماری معلومات میں اضافہ کررہے ہیں۔ اس شمارے میں عابد سہیل، محترمہ قمر جہاں اور ڈاکٹر منظر اعجاز کے مضامین نے اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ یہ مضامین بے حد عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ انہوں نے حق مضمون ادا کردیا ہے۔ تمام افسانے توجہ طلب ہیں، مختلف النوع موضوعات پر لکھے گئے یہ افسانے بہت پسند آئے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے سرحد پار کے شعرا و ادبا کو متعارف کرانے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ یہ آپ کا ہی حصہ ہے کہ ہمیں بہتر ادب پارے پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ نظم کے حصے پر بھی اس بار آپ نے خصوصی توجہ دی ہے۔ کتابوں پر تبصرہ بھی پسند آیا۔ بچوں کے ادب میں علقمہ شبلی، قیصر صدیقی اور حافظ کرناٹکی کی نظمیں بے حد عمدہ ہیں، جو بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے آئندہ سال نو میں ''زبان و ادب'' کی تزئین میں اور بہتری آئے گی۔

ارشد قمر، ڈالٹن گنج، جھارکھنڈ

☆ ''زبان وادب'' کا دسمبر ۲۰۱۵ء کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ میں بہار کا، پرچہ بھی بہار کا، مگر میں بے خبر تھا۔ بے خبری کی وجہ یہ رہی کہ یہ پرچہ کسی اسٹال، دکان پر نظر نہیں آیا۔ میرا رہنا زیادہ تر دہلی میں رہا وہاں تو یہ کہیں نظر نہیں آیا۔ روا روی میں کہیں دیکھا ہوگا جو اب یاد نہیں رہا۔ حال میں سبزی باغ (پٹنہ) سے اکتوبر، نومبر، دسمبر کا شمارہ لیا۔ پڑھنے پر پسند آیا۔ میں دہلی میں اشاعت کے لائن سے جڑا ہوں۔ پروف ریڈنگ کے نظر سے بھی دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ پروف کی غلطیاں نظر نہیں آئیں۔ دو ایک جگہ ہلکی پھلکی غلطیاں تھیں۔ اپنے تاثرات لکھنا چاہ رہا تھا، مگر گرم جوشی نہیں تھی یہاں تک کہ بچوں کے گوشہ کا ایک مضمون ''آئزک نیوٹن'' (ص ۷۵ دسمبر ۲۰۱۵ء) دلچسپی سے پڑھا۔ اس مضمون نے مجبور کیا کہ قلم اٹھاؤں۔ عنوان تو اچھا چنا، مگر حق ادا نہ ہوا۔ کئی پہلو سے مجھے اعتراض ہے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ میری رائے سے اتفاق کیا جائے مگر غور تو کیا جاسکتا ہے۔ چند اعتراض

PDF Compressor Free Version

رقم کرتا ہوں:

☆ بچوں کا گوشہ میں بچوں کی عمر، ان کی نفسیات، ان کا شعور سب کچھ سامنے رکھ کر لکھا جانا چاہئے اپنی قابلیت مقصود نہیں ہونا چاہئے۔

☆ "x-mas" صحیح xmas ہے

☆ آب و گِل (گِل، گل گُل) تینوں بامعنی الفاظ ہیں۔ اعراب سے فرق پیدا کیا جانا چاہئے۔ بچے متشابہ الفاظ میں کم ہی تمیز کر پاتے ہیں۔ ☆ ''طبیعات'' صحیح طبیعیات

☆ ریاض داں صحیح ریاضی داں

☆ پہونچ جدید املا پہنچ

☆ ''وہ سات ماہ..... بچ گیا''۔ بچوں کے لئے یہ سطریں کس کام کی ہیں۔ یہاں نیوٹن کی سوانح عمری لکھنا تو مقصود نہیں ہے، اس کے علم، محنت، لگن..... یہ دکھانا مقصود ہونا چاہئے۔

☆ ''اس کی پیدائش ..... عادت پڑی'' - یہ پورا پیراگراف بے مطلب کا ہے۔ یہ سب سوانح عمری کے لئے مختص ہے۔ یہاں تو صفحہ دو صفحہ میں اصل موضوع پر فوکس ہونا چاہئے۔

☆ ''نیوٹن جب..... دلچسپی تھی'' بے کار کی سطریں ہیں۔

☆ ''حتیٰ کے نیوٹن..... لگایا''۔ بچوں کے لئے لکھے گئے مقالہ میں اس بحث کی کیا ضرورت ہے؟

☆ نظریۂ حرکت (نظریہ حرکت)

☆ مناسب عکس مجذور - یہ اصطلاح کون سمجھے گا؟ انگریزی متبادل ہو تو کچھ سمجھا بھی جائے۔ ☆ مدار (Orbit)

☆ ''اصول ریاضی فلسفی طبیعی''۔ نیوٹن کی کتاب کا اصل نام انگریزی لاطینی میں لکھا جانا چاہئے تھا، مترجم نام نہیں۔

☆ ضراب خانہ.....؟

☆ 'شہسوار' یہ لقب تو کوئی لقب ہی نہیں ہے۔ اصل انگریزی نام لکھنا چاہئے۔

☆ اواخیر - یہ کون سا لفظ ہے؟

☆ west minister - یہ مہمل لفظ ہے۔ اصل لفظ westminster ہے۔ یہ لندن کے ایک مقام کا نام ہے۔

☆ ''چرچ میں دفن کیا گیا''۔ چرچ میں کسی کو دفن نہیں کیا جاتا۔

☆ نقطۂ نظر (نقطۂ نظر)

☆ ص ۴۷ کون ناحق بہائے گا پانی
کون ایسی کرے گا نادانی

☆ ص ۷۸ فٹبال - بیچ بیچ میں خط کا انداز کیوں بدل دیا گیا ہے؟

☆ نہیں! الطاف..... ☆ جمپیئن یہاں بھی خط کا انداز الگ ہے۔

☆ بیچ یہاں بھی وہی انداز ہے۔ ☆ فٹبال ٹیم.....''

ص ۳ ہمارا ارادہ..... ٹورینٹو، امریکہ، لندن، ماریشس اور پاکستان ..... ص ۳۷، امریکا (نشان زد نام ملک کا ہے، شہر کا نہیں۔ بقیہ دو نام شہر کے ہیں، ملک کے نہیں۔ یکسانیت کے لئے یا تو سب جگہ شہر کا نام دیا جائے یا سب جگہ ملک کا نام) ص ۴ اردو اکادمی..... انشاء اللہ (یہ لفظ بہت زیادہ اسی املا کے ساتھ رائج رہا ہے مگر درست نہیں صحیح لفظ وہی ہوگا جو قرآن میں ہے..... ان شاء اللہ) ص ۴۲ - ''ساتھ کا احساس'' - اس کی کیا ضرورت ہے؟ ص ۷۲ منظر عالم، ریونڈھا یہ کوئی مشہور جگہ نہیں، تو سین میں ضلع، صوبہ کی وضاحت کی جاتی۔

جمیل اختر خاں، بچھوارا، بیگوسرائے

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری، ہاوک عزہ پوری کو شال پیش کرتے ہوئے

سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری، فرحت کاظمی کو شال پیش کرتے ہوئے

ایوارڈ یافتگان اپنی سند اور مومنٹو کے ساتھ

دربھنگہ میں ''اکادمی آپ تک'' کا دوسرا پروگرام

پروفیسر عبدالمنان طرزی کو سند پیش کرتے ہوئے
پروائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین اور سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری

اویس احمد دوراں کو سند پیش کرتے ہوئے سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری

ذکی احمد کو سند پیش کرتے ہوئے
پروائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین اور سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری

اویس احمد دوراں کو مومنٹو پیش کرتے ہوئے پروائس چانسلر اور سکریٹری اکادمی

پروائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین جناب دوراں کو اعزاز دیتے ہوئے

PDF Compressor Free Version

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Papers of India R.N. No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2017

Volume : 37 No. 1 Janurary 2016

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

گاندھی میدان کتب میلہ کے موقع پر بہار اردو اکادمی کی جانب سے
منعقدہ مشاعرے میں شعرائے ذی وقار کی کہکشاں

معزز وزیر تکنیقی فلاح ڈاکٹر عبدالغفور
محفل مشاعرہ سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے

دربھنگہ کے ایوارڈ یافتگان اپنی سند اور مومنٹو کے ساتھ دائیں سے بائیں: ذکی احمد، اویس احمد دوراں، پروفیسر عبدالمنان طرزی،
پروفیسر سید ممتاز الدین پرووائس چانسلر گدھ یونیورسٹی، مشتاق احمد نوری سکریٹری بہار اردو اکادمی

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and Published by *Moshtaque Ahmad Noori* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna- 800006

₹ : 10/-